اسلام
اور عصرِ جدید

جولائی ۲۰۲۵ء

[جلد: ۵۷ — شمارہ: ۳]

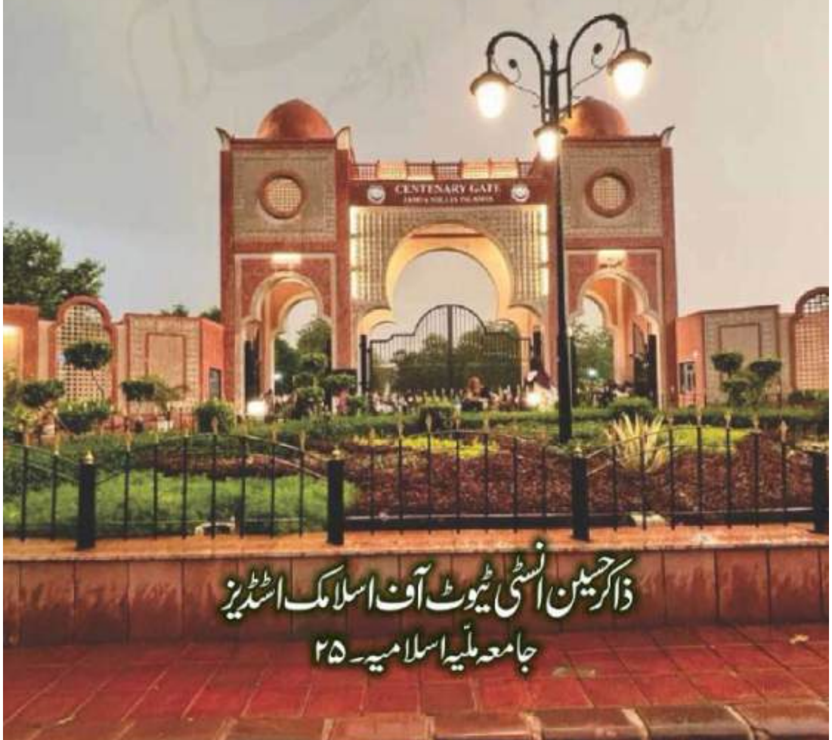

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملّیہ اسلامیہ۔ ۲۵

اسلام اور عصرِ جدید

مدیراعلیٰ

پروفیسر حبیب اللہ خاں

مدیر

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی

نائب مدیر

ڈاکٹر محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

Peer Reviewed

ISSN 2278-2109

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد: ۵۷ | جولائی ۲۰۲۵ء | شمارہ: ۳

زرِ اشتراک

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرونِ ملک	-/100 روپے	-/380 روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

حیاتیاتی رکنیت:

❑ اندرونِ ملک 5000/روپے ❑ پاکستان و بنگلہ دیش 150 امریکی ڈالر ❑ دیگر ممالک 400 امریکی ڈالر

نوشاد عالم
تصحیح وتزئین

فیضی گرافکس
کور ڈزائن

راشد احمد
پرنٹنگ اسسٹنٹ

ملنے کا پتا: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

Website: https://jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

نوٹ: مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

بانی و مدیر

ڈاکٹر سیّد عابد حسین (مرحوم)

شیخ الجامعہ

پروفیسر مظہر آصف (صدر)

مجلسِ مشاورت

- محمد احمد ذکی (لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ)
- سید شاہد مہدی (آئی۔اے۔ایس۔ریٹائرڈ)
- نجیب جنگ (آئی۔اے۔ایس۔ریٹائرڈ)
- پروفیسر طلعت احمد
- پروفیسر نجمہ اختر

مجلسِ ادارت

- پدم شری پروفیسر اختر الواسع
- پروفیسر اقتدار محمد خاں
- پروفیسر عبید اللہ فہد فلاحی
- پروفیسر شمس کمال انجم
- پروفیسر محمد مسیح الرحمٰن
- ڈاکٹر محمد ارشد
- ڈاکٹر صہیب عالم
- ڈاکٹر آفتاب احمد
- پروفیسر زبیر احمد فاروقی
- پروفیسر عبدالحلیم
- پروفیسر فوزان احمد
- پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی
- ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی
- ڈاکٹر ہیفاء شاکری
- ڈاکٹر وارث مظہری

فہرست مراجعین

- پروفیسر محمد اسحاق
  سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

- ڈاکٹر محمد ارشد
  شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

- ڈاکٹر عمر فاروق
  شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

- ڈاکٹر وارث مظہری
  شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد (نئی دہلی)

- پروفیسر ضیاء الدین
  شعبہ اسلامک اسٹڈیز،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)

- ڈاکٹر مغیث احمد
  شعبہ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی (وارانسی)

- ڈاکٹر محمد اجمل قاسمی
  شعبہ عربک، جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی)

فہرست

❑ حرف آغاز | ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی | ۷

❑ خواتینِ اسلام کے تعلیمی وسماجی مسائل
[عالمیت وفضیلت کی طالبات سے مشاورت] | پروفیسر عبید اللہ فہد فلاحی | ۱۱

❑ اسلام میں وقف کا تصور اور سماجی کردار | ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی | ۳۷

❑ اسلام امن وآشتی کا مذہب	خواجہ غلام السدین/ ترجمہ: نثار احمد فاروقی	۶۱
❑ عہد وسطیٰ میں ہندوستانی مسلم مؤرخین کی وقائع نگاری [منتخب التوارخ کے خصوصی حوالے سے]	ڈاکٹر محمد خالد خاں	۸۵
❑ مدارسِ ہند کا نصابِ تعلیم [ایک تاریخی جائزہ]	ڈاکٹر انیس الرحمٰن قاسمی	۹۹
❑ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی مکتوب نگاری	محمد اشفاق عالم	۱۲۱
❑ کشتِ دل۔ایک مطالعہ	فضل الرحمٰن اصلاحی قاسمی	۱۳۱
❑ ہندوستان میں سلاسل اربعہ [ایک تعارف]	شکیل الرحمٰن	۱۴۱

حرف آغاز

اسلام اور عصر جدید آج سے نصف صدی بلکہ اس سے بھی قبل ملک کے ایک دانشور سید عابد حسین کے دامن فکر کی آواز تھی، نصف صدی سے زیادہ کے اس سفر میں اس رسالہ نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ اسلام کی عصری تفہیم اور جدید دور میں اسلام کو درپیش چیلنجوں کا جواب اس رسالہ کی امتیازی خوبی رہی ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے جس جاں سوزی کے ساتھ اس رسالہ کو جاری کیا تھا یہ اسی کا کمال ہے کہ آج بھی یہ رسالہ جاری ہے اور علم و تحقیق کی دنیا میں ایک معتبر نام ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین نے 'اسلام اینڈ ماڈرن ایج' کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی اور اس سے یہ رسالہ جاری کیا بعد میں یہ رسالہ اور پوری سوسائٹی ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' میں ضم ہوگئی اور اس رسالے

کی ذمہ داری جامعہ ملیہ اسلامیہ نے سنبھال لی۔

ڈاکٹر سید عابد نے اس رسالہ کو اس لیے جاری کیا تھا کہ اسلام کی تفہیم اس طرح کی جائے کہ روایت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے قلب وذہن اسلام کی آفاقیت اور عالم گیریت سے پوری طرح مطمئن ہو جائیں۔ چوں کہ یہ ایک نئی آواز تھی اس لیے کچھ لوگوں کو رسالے کے مقاصد کے حوالے سے اندیشہ ہائے دور دراز نے گرفتار کیا۔ اتفاق دیکھیے کہ غلط فہمی میں مبتلا ہونے والی شخصیات میں سید حسین نصر بھی تھے جو ابھی تک بقید حیات اور فعال ہیں، تاہم یہ اندیشے جلد ہی غلط ثابت ہوگئے اور لوگوں نے محسوس کیا کہ یہ رسالہ وقت کی ضرورت ہے۔ خود سید عابد حسین نے اس کا تذکرہ بڑے خوب صورت انداز میں اس طرح کیا ہے:

"پھلی غلط فھمی سید حسین نصر کو، جو اب ھمارے خاص قدر دانوں اور مشیروں میں شامل ھیں، رسالے کے نام کی وجہ سے پیدا ھوئی، یہ تھی کہ رسالے کا مقصد اسلام کی تعلیمات کو عصرِ جدید کے ڈھانچے میں ڈھال کر پیش کرنا ھے، مگر خاکسار مدیر کی اس وضاحت کے بعد کہ ھمارا ھرگز یہ مقصد نھیں ھے، بلکہ صرف اتنا ھے کہ جس طرح اسلام اپنی تاریخ میں بدلتے ھوئے زمانے کے تقاضوں سے نبٹتا آیا ھے، اسے موجودہ زمانے کے 'جسے ھم عصر جدید کھتے ھیں' نئے تقاضوں سے نبٹنا ضروری ھے۔ رفتہ رفتہ ھمارے متعدد روشن خیال علماء، رسالے کو پڑھ کر علامہ نصر سے متفق ھوتے گئے، چنانچہ مولانا

عبدالماجد دریابادی مرحوم جیسے بالغ نظر مبصر نے
'صدق جدید' کے ایک مخصوص نمبر میں یہ ارشاد
فرمایا تھا کہ اگر تجدد سے جو اس رسالے کا شعار کہا
جاتا ہے، مراد یہی چیز ہے، جس کا نمونہ اس کے
ابتدائی مضامین ہیں، تو اس پر کسی صاحب انصاف
کو اعتراض نہیں ہوسکتا۔"

اسلام اور عصر جدید سید عابد حسین کی باقیات صالحات میں سے ہے۔ امید ہے کہ یہ چمن اسی طرح اسلام کی آبیاری کرتا رہے گا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی اپنی عمر کی ایک صدی مکمل کر کے دوسرے صد سالہ میں گامزن ہوا ہے اور اس میں بھی پنج سالہ سفر پورا کر چکا ہے۔ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کا دن تھا جب کچھ سرفروشوں نے اپنے تعلیمی نظام کو استعماری طاقتوں سے آزاد کرانے کے لیے نہایت بے سروسامانی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کیا۔ جامعہ کی تاریخ جدوجہد اور سرفروشی کی وہ لافانی تاریخ ہے جس کی مثال تعلیمی اداروں میں شاذ ونادر ہی ملے گی۔ وقت کے فرعون سے ٹکرا کر طوفانی ہواؤں اور باد مخالف کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس ادارے نے پوری ایک صدی کا سفر طے کیا ہے۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ مدتوں اس جامعہ کے پاس اپنی جگہ ہی نہیں تھی جہاں طالب علم پڑھ سکیں۔ درختوں کی چھاؤں اور خیموں کی طنابوں کے درمیان محدود وسائل کے ساتھ اس ادارے نے اپنے سفر کا آغاز کیا، لیکن منزل دشوار گزار تھی اس لیے ہجرت کر کے دہلی کا رخ کیا اور کچھ اہلِ خیر کے تبرعات کے سہارے قرول باغ کے علمی ماحول میں اپنی بنیادیں استوار کرنے کی کوششیں کیں۔

قرول باغ میں دس سال کی جدوجہد کے بعد یہ آشکارا ہوا کہ

اوکھلا کی سرزمین اس ادارے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔
اس طرح یہ ادارہ پھر مہاجر بنا اور ۱۹۳۵ء میں اوکھلا میں آ کر آباد ہوا۔
یہ جگہ ادارے کو راس آئی، یہاں یہ ادارہ تعلیم وتدریس کے ساتھ جدوجہد آزادی کا مرکز بنا، گاندھی جی کی آرزوؤں کا محور بنا، آزادی کے بعد ڈیمڈ یونیورسٹی اور پھر جلد ہی مرکزی یونیورسٹی بن گیا۔ آج اس دارے کی عالمی شناخت ہے اور دنیا میں اداروں کے مقام ومرتبہ کو متعین کرنے کے جتنے بھی پیمانے ہیں سبھی میں یہ ادارہ صف اول کے اداروں میں شامل ہے۔ حالاں کہ اس ادارے کی عظمت کے لیے تمام پیمانے قبائے تنگ کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کا دائرہ خدمات بہت وسیع ہے۔ جامعہ تعلیم وتدریس کے ساتھ ساتھ سیرت سازی میں نمایاں کردار کا حامل رہا ہے۔ یہاں سے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کے مثالی نمونے ملے۔ ملک کی تعمیر وترقی میں اس ادارے نے نمایاں کردار ادا کیا۔ فلم جگت سے کھیل جگت اور وسائل اعلام سے ایوان حکومت تک، سماجی علوم سے سائنس اور ٹکنالوجی کے اعلیٰ اداروں تک جامعہ کی خدمات دیکھی جاسکتی ہیں۔ امید ہے کہ یہ سیل رواں علم وادب، تہذیب وثقافت اور فنون وہنر کے جواہر ریزے اسی طرح بکھیرتا رہے گا اور ملک کی تعمیر وترقی میں اپنا نمایاں کردار ادا کرے گا۔

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی

پروفیسر عبیداللہ فہد فلاحی *

خواتینِ اسلام کے تعلیمی وسماجی مسائل

(عالمیت وفضیلت کی طالبات سے مشاورت)

ملک کے معروف تعلیمی ادارہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ اتر پردیش کے کلیۃ البنات میں ۸؍جولائی ۲۰۲۴ء کو حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ طالبات دارالاقامہ صفیہ منزل کے وسیع وعریض ہال میں امام ابو حامد الغزالیؒ کے تعلیمی افکار پر گفتگو کے بعد سوال وجواب کی طویل نشست ہوئی۔[1]

جامعۃ الفلاح کا نصاب تعلیم اسلامی وعربی علوم کے ساتھ بعض اہم عصری مضامین اور زبانوں کا سنگم ہے۔ طریقۂ تعلیم روایتی نہیں، تحقیقی واستخراجی ہے۔ فقہ اسلامی کی تدریس میں تقابلی اسلوب کی بھرپور رعایت ہے تاکہ مسلکی تعصب کو راہ نہ مل سکے اور قرآن وحدیث سے راست استفادہ کر کے طلبہ وطالبات اسلام کی موثر ترجمانی کر سکیں۔

جامعۃ الفلاح میں طالبات کا شعبہ علاحدہ قائم ہے۔ وسیع کیمپس میں خواتین کا دارالاقامہ اور مسجد بھی ہے۔ طلبہ وطالبات کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے زائد اور معلمین ومعلمات کی تعداد ۱۶۹

* پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ای میل: fahad.is@amu.ac.in

ہے۔[۲]

کلیۃ البنات کا وسیع وعریض ہال باحجاب خواتین سے پُر تھا۔ بیشتر طالبات کے ہاتھوں میں کاپی اور قلم کی موجودگی علم وادب سے اُن کی دلچسپی ظاہر کررہی تھی۔ راقم نے چالیس منٹ کی تقریر میں امام الغزالیؒ کی کتاب احیاءعلوم الدین سے استفادہ کرتے ہوئے طلبِ علم کے آداب اور ضوابط پر سامعہ خراشی کی۔ امام الغزالیؒ نے درج ذیل آداب کی رعایت کو طالب علم کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے:

۱۔ فکری وعقائدی طہارت کا لزوم
۲۔ متاعِ دنیا کی مقصودیت سے اجتناب
۳۔ تکبر اور انانیت سے سخت پرہیز
۴۔ اختلافِ فکر سے آغاز میں بچنے کی تلقین
۵۔ مقبولِ عام مضمون یافن سے واقفیت
۶۔ علوم کی تنظیم اور درجہ بندی
۷۔ جلد بازی اور بے صبری سے دور رہنا
۸۔ اشرف علوم کا انتخاب
۹۔ تزکیہ نفس پر زور
۱۰۔ نصب العین سے علم کے رشتہ کی وضاحت

طالبات کے سوالات بلاشبہ دلچسپ تھے۔ بعض سوالات کی نوعیت تعلیم وتدریس کے مسائل سے متعلق تھی جب کہ کچھ طالبات نے دینی وشرعی امور کی تفہیم پر زور دیا تھا۔ دوسوالات مسئلہ فلسطین سے متعلق تھے جن سے اُن کی عالم اسلام سے دلچسپی مترشح تھی۔ کچھ طالبات نے خطیب کی شخصیت اور اُس کے علمی وفکری ارتقا کے جاں گداز مراحل کو کریدا تھا تاکہ انھیں زندگی کی تلخیوں سے آشنائی ہوسکے اور اُن سے نبردآزما ہونے کا حوصلہ مل سکے۔

خوداعتمادی کا قرآنی فلسفہ

ہر انسان کے اندر اللہ نے صلاحیتیں ودیعت کر رکھی ہیں اُن کو پہچاننا اور اُن کے مطابق

میدانِ عمل کا انتخاب کرنا ہر فرد کا حق ہے لیکن سوال یہ تھا کہ یہ عرفان کیسے حاصل ہو؟ عصری جامعات میں ماسٹرز کی تکمیل کے بعد جب ریسرچ میں داخلہ ہوتا ہے تو بالعموم طلبہ وطالبات کے سامنے یہی سوال آ کھڑا ہوتا ہے۔ انھیں مشاورت کی ضرورت ہوتی ہے کہ میدانِ تحقیق میں اُن کی دلچسپی کے امکانات کیا ہوسکتے ہیں تاکہ تحقیق کا عمل انھیں گراں محسوس نہ ہو۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ریسرچ اسکالرز دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں مگر اپنے موضوعِ تحقیق پر گفتگو کرنے سے کتراتے ہیں۔

طلبہ وطالبات اپنا نتیجہ کارڈ دیکھیں۔ وہ کون سے مضامین ہیں جن میں اُن کے نمبر دوسرے مضامین سے بہتر ہیں۔ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے مگر عام طور سے اُن کی دلچسپی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر ادب میں اگر اُن کے نمبر دوسرے مضامین سے زیادہ ہیں تو انھیں ادب کے میدان کو اپنی جولان گاہ بنانا چاہیے۔ جب اِس میدان میں مطالعہ کی مقدار بڑھے گی تو اُن کی دلچسپیوں کا تناسب بھی بڑھے گا اور بتدریج ادب پر اُن کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور کچھ دنوں کے بعد ادبی موضوعات اُن کی تحریر وتقریر کا محور ہوں گے۔

خوداعتمادی کیسے پیدا کی جائے اور اُس میں اضافہ کیسے ممکن ہے؟ یہ دوسری طالبہ کا سوال تھا۔

ہر انسان کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ اللہ نے اُسے بہترین ساخت اور شکل وصورت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اُس کی پیدائش میں کوئی نقص ہے نہ اُس کی صلاحیت میں کوئی کھوٹ ہے۔ وہ مکمل اور خوبصورت انسان ہے اور معاشرہ کو عطا کرنے کے قابل ہے۔ اُس کو وہ اعلیٰ درجے کا جسم عطا کیا گیا ہے جو کسی جان دار مخلوق کو نہیں دیا گیا، اور اُسے فکر وفہم اور علم وعقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی گئی ہیں جو کسی دوسرے مخلوق کو نہیں بخشی گئیں۔[۳] قرآن نے اس حقیقت کو بڑے دل نشیں انداز میں بیان کیا ہے:

> لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ . (ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔)

مولانا امین احسن اصلاحی (۱۹۹۷-۱۹۰۴ء) اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو نہایت اعلیٰ مقصد کے لیے بہترین صلاحیتوں سے آراستہ کیا ہے۔ اعلیٰ مقصد ہے اس دارالامتحان میں صراطِ مستقیم پر گامزن رہنا اور شیطان کی ترغیبات وتربیات سے دامن کش رہنا۔ اس مقصد کے لیے اُسے اشرف المخلوقات بنایا اور اُسے باطنی صلاحیتیں بھی اعلیٰ درجے کی عطا کیں۔ وہ ذی عقل اور ذی

ارادہ ہستی ہے۔ دوسری مخلوقات کی طرح عقل وارادہ سے محروم نہیں ہے۔ اُسے خیر وشر میں امتیاز کرنے کی اعلیٰ صلاحیت ودیعت کی ہے۔ [۴]

اِس ایمان ویقین کے بعد خود اعتمادی سے محرومی کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی۔ ضرورت ہوتی ہے اللہ پر ایمان کے ساتھ اپنی خفتہ صلاحیتوں کے عرفان کی اور اُس کے مطابق رزم گاہ حیات میں منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھنے کی۔ پھر مستقبل کی کامیابی کے راستے کھلتے چلے جاتے ہیں۔

مضمون نویسی کا فن

ایک سوال تھا:

ہم چاہتے ہیں کہ ماہوار رسالے میں مضمون شائع ہو مگر بار بار ارادہ ہوتا اور ٹوٹ جاتا ہے۔ ارادے میں پختگی کیسے آئے؟

اِسی سے ملتا جلتا ایک دیگر طالبہ نے سوال کیا:

مضامین کو کتابی شکل دینے کی صورت کیا ہو؟ تفصیل سے اظہارِ خیال کریں۔

مضمون نویسی ایک فن ہے جو ریاضت اور مشق کا متقاضی ہے۔ کسی معلّمہ سے، جو خود مضمون نگار ہوں، مسلسل رابطہ ناگزیر ہے۔ اس کے لیے کسی ایک مضمون میں منتخب مصنفین کی تحریروں کا مسلسل مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ مطالعہ اتنا زیادہ ہو جائے کہ قلم اٹھانے پر آدمی مجبور ہو جائے۔ ایسی صورت میں خیالات وافکار کی آمد خود ہوتی ہے۔ ہر تحریر قابلِ مطالعہ نہیں ہوتی۔ پختہ قلم کاروں کی تحریریں پڑھنا زیادہ کارآمد ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبلی نعمانی، سر سید احمد خاں، علامہ محمد اقبال، مولانا محمد تقی امینی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مفتی محمد شفیع، مولانا ثناء اللہ امرتسری۔ یہ سب اردو دینی واصلاحی ادب کے اساطین ہیں۔ اِن کی تحریروں کا مطالعہ ذہن وفکر کو جلا بخشتا ہے اور زبان وبیان کی لطافتوں سے قاری کو ہم کنار کرتا ہے۔

خواتین کے حقوق وفرائض پر بطورِ خاص مولانا اشرف علی تھانوی کی تحریریں اہم ہیں۔ معاصر دنیا میں مولانا سید جلال الدین عمری نے ایک درجن سے زائد کتابیں تحریر کی ہیں۔ اسلوب عام فہم اور دل

نشیں ہے اور اصلی مصادر سے براہِ راست استفادہ ہے۔ مولانا عمری کی خدمات وافکار پر شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں راقم کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کا ایک مقالہ بھی تیار ہورہا ہے۔ اِن ادیبوں اور قلم کاروں کا مطالعہ کرنا اور حاصل مطالعہ مرتب کرنا پہلا زینہ ہے۔

کسی پختہ کار مضمون نگار کی راہ نمائی میں ایک ایک دو دو مضامین تیار کرکے شائع کرائیں اور جب دس بارہ مضامین شائع ہوجائیں تو اُن ہی کا مجموعہ کتاب کی صورت میں منظرِ عام پر آتا ہے۔ کتاب شائع کرتے وقت مضامین پر نظرِ ثانی کرنا ضروری ہے۔ قارئین کے مشوروں کی روشنی میں مضامین میں حسبِ ضرورت ردّ وبدل کرنا ضروری ہے۔ کتاب کا عنوان طویل ہو نہ مشکل اور دقیق ہو۔ براہِ راست ابلاغ سے کتاب کی اہمیت دو چند ہوجاتی ہے۔ طول طویل عنوانات ذہن ودماغ کے لیے اکتاہٹ کا سبب بنتے ہیں اور اپنی کشش کھودیتے ہیں۔ عنوان میں ندرت بھی ضروری ہے۔

خواتین کا میدانِ عمل

ایک طالبہ نے اپنے لیے دو میدان ہائے عمل کے انتخاب کی بابت مشاورت چاہی اور یہ کہ اُن کی یہ منصوبہ بندی درست ہے یا نہیں؟ دوسری طالبہ نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ خواتین کے لیے مناسب دو میدان کون سے ہوسکتے ہیں؟

اس کا مناسب جواب کوئی خاتون دیتی تو بہتر تھا۔ دو میدان ہائے عمل کا انتخاب شرعی اور قانونی اعتبار سے درست ہے مگر حکمتِ عملی کے اعتبار سے نامناسب ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آغاز کار میں کسی ایک میدان کا انتخاب کرنا قابل ترجیح ہے۔ جب اُس میدان کے مبادی سے واقفیت ہوجائے اور طویل تجربات کی روشنی میں اُس میدانِ عمل پر قابو حاصل ہوجائے اور ذہن مطمئن ہوکہ وقت آگیا ہے کسی دوسرے متعلقہ میدانِ عمل میں طبع آزمائی کا، تو اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کا بیشتر حصہ پہلے سے منتخب کردہ میدان میں صرف کرلے اور پچیس فیصد توانائی دوسرے میدان پر صرف کرے۔ دونوں میدانوں میں کام کرنے کا یہ تناسب ہر حال میں قائم رہے ورنہ شتر گربگی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا اور وہ مثل صادق آئے گی: ’’کوّا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھول گیا‘‘

خواتین کسی بھی میدانِ عمل کا انتخاب کریں، اللہ نے انھیں بھرپور صلاحیت عطا کی ہے۔ وہ

رزم گاہِ حیات میں کامیاب ہوں گی۔ بس اللہ پر بھروسہ رکھیں اور اپنی قوتِ بازو پر۔ یاد رکھیں، انسانوں کے سامنے کاسۂ گدائی پھیلانا اللہ کے جبروت اور اُس کی کبریائی کو چیلنج کرنا ہے۔ ویسے تعلیم و تدریس کا میدان اُن کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اصلاح معاشرہ کی انجام دہی کے لیے اِس میدان کا انتخاب قابلِ ترجیح ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے تقاضے اور شریعت کے حدود

دو خواتین نے سوالات اٹھائے جو دینی و اصلاحی ادبیات کی نامکمل ترجمانی کی وجہ سے اکثر ذہنوں میں کُلبلاتے ہیں۔ ایک سوال اعلیٰ تعلیم اور شریعت کے درمیان تصادم کا مظہر تھا اور دوسرا سوال انتظامی خدمات (Administrative Services) اور یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحانات اور تقرریوں کے نتیجے میں شرعی پردہ کی رعایت سے متعلق تھا۔ ''توحید کی تعلیمات پر عمل کرنے سے کوئی نہیں روکتا مگر اِن شعبوں میں تقرری اور کام کرنے سے شرعی پردہ پر حرف آتا ہے۔'' طالبہ نے میری رائے معلوم کی تھی۔

اعلیٰ تعلیم اور شریعت میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ خواتین اسلامی آداب کی رعایت کے ساتھ تعلیم کے کسی شعبے میں بھی جاسکتی ہیں۔ آداب و فنون، سماجی و عمرانی علوم، طبیعی علوم، انجینئرنگ، ٹکنالوجی، کمپیوٹر سائنس، طب و سماجی خدمات کے تمام میدان اُن کے لیے سازگار ہیں۔ دونوں ہتھیلیوں اور چہرے کو کھولنے کی اجازت چاروں مکاتبِ فقہ اور شیعہ فقہ میں بھی موجود ہے۔ علامہ محمد ناصر الالبانی (متوفی: ۱۹۹۹ء) نے گھر سے باہر قدم نکالتے وقت خواتین اسلام کے لیے آٹھ شرطوں کی تکمیل ناگزیر قرار دی ہے۔ قرآن مجید کی آیات، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار سلف کے مفصل مطالعہ سے انھوں نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان شرائط کو ملحوظ رکھنے سے اسلامی حجاب کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں:

۱۔ چہرہ اور دونوں ہاتھوں کے سوا پورا بدن چھپ جائے۔

۲۔ لباس بجائے خود زینت نہ ہو۔

۳۔ لباس اتنا باریک نہ ہو کہ بدن جھانکتا نظر آئے۔

۴۔ لباس اتنا چست اور تنگ نہ ہو کہ جسمانی خد و خال اور نشیب و فراز کی نمائش ہو۔

۵۔ کسی خوشبو کا استعمال نہ ہو۔
۶۔ مردوں کے لباس کے مشابہ نہ ہو۔
۷۔ کافر عورتوں کے لباس سے مشابہت نہ ہو اور
۸۔ شہرت اور خود نمائی والا لباس نہ ہو۔[۵]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے علمائے ہند نے چہرہ کے پردہ کو واجب قرار دیا تھا مگر علامہ ناصر البانی،[۶] شیخ یوسف القرضاوی (۲۰۲۲-۱۹۲۶ء) شیخ محمد الغزالی (۱۹۹۶-۱۹۱۷) شمس پیرزادہ مصنف دعوت القرآن، پروفیسر خورشید احمد (متوفی: ۲۰۲۵ء) عالم عرب اور جنوب مشرقی ایشیا کے علماء اور اسلامی تحریکوں کے رہنما دونوں ہاتھوں اور چہرہ کو حجاب میں شامل نہیں سمجھتے۔ جماعت اسلامی ہند کے عالم دین ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی بھی خواتین اسلام کو یہ حق دیتے ہیں کہ دونوں میں سے جس موقف کو وہ بہتر سمجھیں اختیار کر لیں کیوں کہ عہد صحابہ سے دونوں دائیں موجود رہی ہیں۔[۷]

اسلامی حجاب کے مذکورہ بالا آداب وشرائط کی تکمیل ہو تو خواتین اسلام زندگی کے تمام میدانوں میں اپنے جوہر دکھا سکتی ہیں۔ ہندوستان کے تکثیری سماج میں بھی مسلمان خواتین کے لیے ممکن ہے کہ وہ اسلامی حجاب کی رعایت رکھتے ہوئے شہری انتظامیہ، عدلیہ اور فوج میں ملازمت کر سکیں۔ لیکن اگر اُن کے لیے اسلامی حجاب کے آداب کی رعات ناممکن ہو جائے تو اِن شعبوں میں جانے سے پرہیز کریں۔ دور رسالت میں سماج، سیاست اور فوج میں خواتین اسلام کی نمائندگی موجود تھی۔

مصری عالم شیخ ابوعبدالرحمٰن عبدالحلیم محمد ابو شقّہ نے پانچ ضخیم جلدوں میں خواتین اسلام سے متعلق وہ تمام احادیث صحیحہ جمع کر دی ہیں جو صحاح ستہ میں، موطّا امام مالك، زوائد صحیح ابن حبّان، مسند احمد، المعجم الكبير للطبرانی، المعجم الاوسط للطبرانی، المعجم الصغير للطبرانی، مسند البزّار اور مسند ابی يعلىٰ میں موجود ہیں۔ ان چودہ کتب احادیث سے استفادہ کر کے انھوں نے کتاب لکھی: "**تحرير المرأة فی عصر الرسالة**" ایک جلد میں اس کی ایک تلخیص بھی تیار ہو گئی اور اس کا اردو میں ترجمہ ہو گیا: "خواتین کی آزادی عہدِ رسالت میں"۔

اِن احادیث میں سماج ومعاشرت میں صحابیات کی بھر پور شرکت کے واقعات وشواہد موجود ہیں۔ ابواب کی سرخیوں سے ہی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

باب اول: بخاری و مسلم میں عورت کی شخصیت۔

باب دوم: معاشرتی زندگی میں مسلمان خاتون کی شرکت۔

باب سوم: معاشرتی زندگی میں عورت کی شرکت اور مردوں سے اُس کی ملاقات کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ ایک گفتگو۔

زبان دانی کے لیے مناسب ماحول

ایک خاتون کا سوال عربی زبان میں مہارت کی کمی سے متعلق تھا جب کہ عربی لغت استعمال میں رہتی ہے اور عربی کتابیں ہم لوگ پڑھتے ہیں، دوسری طرف انگریزی بولنے والے ہی اُس پر قابو پا لیتے ہیں؟

عربی زبان سیکھنے میں دشواری کی ایک وجہ داخلی ہے۔ طلبہ وطالبات کو عربی کی تاجرانہ اور دنیاوی قدر کا احساس نہیں ہو پاتا۔ ہر طرف انگریزی زبان کی حکومت ہے۔ ملازمت سے لے کر اعلیٰ تمدنی زندگی گزارنے تک ہر مرحلے میں اُس کی ناگزیریت کا احساس ہوتا ہے جب کہ عربی کا کوئی تعلق کسی منفعت سے نہیں ہے۔ عربی زبان پڑھنے والا کتاب وسنت کی زبان سمجھ کر اُسے پڑھتا ہے تاکہ مذہب اسلام کو اُس کے اصل مآخذ سے سمجھ سکے۔ حصولِ ثواب کے جذبے پر حصولِ منفعت کا جذبہ غالب آ جاتا ہے۔ زبان دانی اندرونی طلب اور جذبے کی تپش کی طالب ہوتی ہے جس سے طلبہ بالعموم محروم ہوتے ہیں۔

دوسری وجہ خارجی ہے۔ کسی زبان کو سیکھنے میں ماحول کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کے طلبہ اپنا وقت زیادہ تر اُسی زبان کے ماحول میں گزارتے ہیں۔ والدین ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں طالب علم سے بات کرتے ہیں۔ اسکول میں اساتذہ انگریزی بولتے ہیں۔ ہم جماعت طلبہ انگریزی ہی میں کلام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹیلی ویژن نشریات، موبائل، سوشل میڈیا ہر جگہ دیسی انگریزی یا انگریزی نما ہندی کا غلبہ ہے۔ اس کے مقابلے میں عربی زبان کو یہ تمام مواقع حاصل نہیں۔ عربی سیکھنے والا ماحول میں اجنبی بن کر رہ جاتا ہے۔ چند دنوں تک پیہم دریافت کرنے کے بعد طالب علم کی آرزو دم توڑ دیتی ہے۔

ان سب کے باوجود مندرجہ ذیل امور کو اگر بروئے کار لائیں تو عربی سیکھنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔عربی سیکھنے کے لیے عربی بولنے والے احباب کا گروپ بنائیے۔آغاز میں قواعد سے بے نیاز ہو کر آپس میں عربی میں بات کرنے کے خوگر بنیئے۔عربی زبان میں ناول، افسانے خوب پڑھیے۔تفریحی ادب کا مطالعہ بڑا کارگر ثابت ہوتا ہے۔اپنے ذوق اور پسند کے موضوع پر عربی ناولیں پڑھیئے۔کلاس روم سے باہر آپس میں عربی ہی میں بات کیجیے۔اس معاملے میں دوسروں کی تنقید اور استخفاف کو خاطر میں نہ لائیے۔کچھ ہی دنوں میں اپنے اندر ایک ارتقائی کیفیت اور ایک نامانوس سرشاری کا احساس ہوگا۔عربی اخبارات ورسائل کے مطالعہ سے شغف بڑھ جائے گا۔

فقہ وحدیث کی تدریس

دو سوالات فقہ اور حدیث کی تدریس کے منہج سے متعلق پوچھے گئے۔حدیث کی تدریس کا ایک منہج وہ ہے جو دارالعلوم دیوبند اور دوسرے مدارس میں رائج ہے۔اعلیٰ درجات میں صحاحِ ستہ میں سے کسی ایک کتاب کی مکمل خواندگی، ترجمہ اور مختصر تشریح کی جاتی ہے جس کو اصطلاح میں دورۂ حدیث کہا جاتا ہے۔اس منہج کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور عمل کی معلومات طلبہ کو سیر سری طور سے ہو جاتی ہیں۔وہ آگے چل کر علم حدیث میں تبحر حاصل کرنے کے مجاز ہو جاتے ہیں بشرطیکہ وہ کنی کے لیے تیار ہوں۔

جامعۃ الفلاح، مدرسۃ الاصلاح اور جامعہ سلفیہ وغیرہ مدارس میں احادیث کے مختلف مجموعوں کے منتخب ابواب کی مفصل تدریس ہوتی ہے۔اس منہج میں دورۂ حدیث کا فائدہ حاصل نہیں ہو پاتا۔مختلف کتبِ احادیث کے اسلوب، جمع وتبویب، تخریج احکام کے منہج سے طلبہ کو واقفیت ہوتی ہے۔انھیں بخاری ومسلم اور ترمذی ونسائی وغیرہ کی خصوصیات معلوم ہو جاتی ہیں جن کی بنیاد پر آگے چل کر علوم حدیث میں نظر پیدا کرنے کی صلاحیت اور مواقع طلبہ کو حاصل ہو جاتے ہیں۔

تعلیم حدیث کے دونوں منہج طلبہ کو ابتدائی معلومات فراہم کرتے ہیں اور بس۔بدقسمتی سے طلبہ مدارس سے فراغت پاتے ہی اپنے کو علم حدیث کا ماہر فن سمجھنے لگتے ہیں۔مزید دریافت سے کتراتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر علوم حدیث سے نابلد ہی رہ جاتے ہیں۔علوم حدیث بحر ناپیدا کنار ہے، جتنی

غوّاصی کی جائے لاعلمی اور جہالت کا احساس بڑھتا جاتا ہے، اسی لیے جو ماہرِفن ہوتے ہیں وہ متواضع اور منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے علوم حدیث سے شغف بڑھتا ہے اُن کے انکسار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

بیشتر مدارس میں فقہ کی تعلیم کسی ایک مکتب فکر کی امہاتِ کتب کی خواندگی اور اُن کی تشریح پر مشتمل ہوتی ہے۔ طلبہ اپنے مکتب فکر کے ائمہ وفقہاء کی آرا اور دلائل عقل ونقل سے واقف ہوجاتے ہیں۔ جامعۃ الفلاح میں فقہ مقارن کا منہج رائج ہے۔ ائمہ اربعہ کے فقہی اقوال اور اُن کے دلائل کا تقابلی مطالعہ علم وفکر میں توسع پیدا کرتا ہے۔ فرقہ واریت اور فقہی تصلب کی جگہ امت واحدہ کے تمام رجحانات سے استفادہ کا ماحول بنتا ہے۔ قرآن وسنت سے استنباط کے تمام اسالیب ومناہج سے واقفیت ہوتی ہے اور تمام فقہائے عظام کے تئیں احترام وتعظیم کا احساس دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔ یہی صلاحیت آگے چل کر ایک عالم دین کے اندر اجتہاد پیدا کرتی ہے تو نئے پیش آمدہ حالات پر وہ نصوص کتاب وسنت کا انطباق کھلے ذہن سے کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔

ویسے آج کے تجدد زدہ ماحول میں، جہاں ہر جدید تعلیم یافتہ فرد مفتی اور مجتہد بنا بیٹھا ہے، تقلید کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ عام مسلمان ایک مکتب فکر سے وابستہ ہوکر فقہی احکام پر عمل کرتے ہیں تو مضائقہ نہیں۔ مغرب زدہ اور زعفرانی تہذیب سے مسحور ماحول میں شاید یہی بہتر ہے۔ کتاب وسنت کی تعلیمات سے ہر شخص واقف نہیں ہوتا۔ اُسے کسی ثقہ عالم دین کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ البتہ علمائے دین جو دین میں تفقہ اور شریعت کے معاملات میں گہرا فہم اور بصیرت رکھتے ہیں، انھیں تقلید کی جگہ اجتہاد پر عمل کرنا چاہیے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا موقف یہی ہے۔

تعلیم کے لیے والدین کی رضامندی

فضیلت کی ایک طالبہ نے جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش مند معلوم ہوتی تھیں، والدین کی رضامندی حاصل نہ ہونے کا شکوہ کیا۔ یہ صورت حال غریب گھرانوں میں عام ہے۔ والدین اپنی بیٹیوں کو اتنی تعلیم دلانے کے حق میں ہوتے ہیں جس سے اُن کا رشتہ اچھے گھرانے میں طے ہوسکے اور وہ سسرال میں خوش وخرّم رہیں۔ دینی ماحول میں پرورش پانے والے افراد بھی اس معاملے میں تفریق

کرتے ہیں۔ بیٹوں کو انجینئرنگ، طب اور کمپیوٹر کی اعلیٰ تعلیم دلاتے ہیں اور بیٹیوں کو آداب وفنون میں ایم اے کرادیں تو فخر سے اپنا سینہ چوڑا کر لیتے ہیں۔ ذہن میں دینی واصلاحی ادب کا بیانیہ گردش کرتا رہتا ہے کہ خواتین شمع خانہ ہیں۔ شمعِ محفل نہیں۔

شمعِ خانہ بمقابلہ شمعِ محفل کے بیانیہ نے مسلمان خواتین کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع سے تقریباً محروم کردیا ہے۔[9] قرآن نے صراحت سے کہا تھا:

وَالْـمُـؤْمِـنُـونَ وَالْـمُـؤْمِـنَـاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَـاء بَعْضٍ يَـأْمُرُونَ بِـالْـمَـعْـرُوفِ وَيَـنْـهَـوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاَةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ أُوْلَـئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّهُ إِنَّ اللّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ. (التوبہ:۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم ودانا ہے۔

مَنْ عَـمِـلَ صَـالِحاً مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُواْ يَعْمَلُون. (النحل:۹۷)

جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اُسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو اُن کا اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔[10]

زیرِ بحث مسئلے میں والدین کی کم نظری، قرآنی تعلیمات سے ناواقفیت اور معاشرہ میں رائج ناقص تصورات کے ساتھ خود طالبات بھی ذمہ دار ہیں۔ دورانِ تعلیم اُن کا رویہ، اُن کے معمولات، والدین اور رشتہ داروں سے اُن کے بدلتے تعلقات بھی منفی ماحول پیدا کردیتے ہیں۔ عام طور سے طالبات امور خانہ داری سے فرار حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اُن کے اندر احساسِ برتری پرورش پانے لگتا ہے۔ اُن کا رویہ منفی ردّعمل کا شکار ہوجاتا ہے۔ رشتے ناطے خراب ہونے لگتے ہیں۔ صلہ رحمی کی جگہ قطعِ

رحم غالب آنے لگتا ہے اور والدین کو اُن کے بدلتے رویے کی فکر ستانے لگتی ہے۔

طالبات اگر اپنی ذمہ داری محسوس کریں، سنجیدگی سے بوقت فرصت امور خانہ داری میں حصہ لیں، والدین کے حقوق کی ادائیگی میں زیادہ فکر مندی کا مظاہرہ کریں، رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات کو منصوبہ بندی کے ساتھ مستحکم کریں، اپنی اعلیٰ تعلیم کے مثبت اور ذمہ دارانہ اثرات کا مظاہرہ کریں تو صورتِ حال تبدیل ہوسکتی ہے۔ والدین آگے بڑھ کر مزید تعلیم کی راہیں استوار کرسکتے ہیں۔ انھیں اطمینان اور قلبی سکون مل سکتا ہے کہ اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلا کر انھوں نے اپنا فرض نبھایا ہے اور معاشرہ کو تعلیم یافتہ بنانے میں موثر کردار ادا کیا ہے۔

مخلوط تعلیم کی نزاکتیں

طالبات کے تین سوالات مخلوط تعلیم کے اثرات اور اس کی شرعی حیثیت سے متعلق تھے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتیں ہیں۔ مرد وزن کا یہ اختلاط بڑے مفاسد کو جنم دیتا ہے۔ مردوں سے خواتین کا تعلیم حاصل کرنا کس طرح درست ہے؟

مخلوط تعلیمی نظام بلا شبہ دورِ جدید کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس کے خطرات اور مفاسد کا کوئی انکار نہیں کرسکتا مگر خواتین کی اعلیٰ تعلیم کا نظم بھی اُتنا ہی ضروری ہے۔ ہمارے دینی ادب میں اختلاطِ مرد وزن پر وسیع لٹریچر موجود ہے۔ اسلامی آداب وشرائط کو ملحوظ رکھ کر تعلیم وتعلّم کی خاطر اس طرح کی مخلوط مجلسوں اور ملاقاتوں کے واقعات دورِ نبوی سے ہمیں فراہم ہوتے ہیں۔ شیخ عبدالحلیم ابو شقّہ نے اپنی کتاب میں فصل پنجم کا عنوان قائم کیا ہے: ''عہدِ نبوی کی معاشرتی زندگی میں مسلمان خواتین کی شرکت کے واقعات'' اس فصل میں فاضل مصنف نے ''طلب علم کے دوران مردوں اور عورتوں کی شرکت اور اُن کی ملاقات'' کے تحت مختلف احادیث درج کی ہیں۔ امام بخاری نے کتاب العلم میں ایک باب قائم کیا ہے: ''**باب عظة الإمام النسآء وتعليمهنّ**''. (امام کے ذریعہ خواتین کو نصیحت کرنے اور انھیں تعلیم دینے کا باب)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

أنّ رسولُ اللّٰـه صلى اللّٰه عليه وسلم خرج ومعه بلالٌ فَظَنّ

أنّـه، لـم یُسـمـع الـنّساء فوعظھُنّ و أمرَھنّ بالصدقة فجعلت المرأة تُلقی القُرط والخاتم، وبلالٌ یأخذ في طرف توبہٖ . [۱۱]

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے۔آپ کے ساتھ بلال بھی تھے۔آپ کو خیال گزرا کہ خواتین سننے سے محروم رہ گئی ہیں تو آپ نے انھیں بھی نصیحت کی اور صدقہ کرنے کا حکم دیا۔خواتین اپنی انگوٹھیاں اور کانوں کی بالیاں ڈالنے لگیں۔ بلال اپنے کپڑے کو پکڑے ہوئے تھے (جس میں خواتین صدقہ کی چیزیں ڈال رہی تھیں۔)

ابن جُریج کی روایت میں مزید تفصیلات موجود ہیں۔حضرت عطاء کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبداللہ کو کہتے ہوئے سنا:

قـام الـنبـی صـلـی الـلّٰـه عـلیـه وسلم یـومَ الفطر فَصَلّٰی فبدأ بـالـصّلوٰة ثم خطبَ فلمّا فرغ نزلَ فأتی النّساء فذکّرھنّ وھو یتـوکّـأُ عـلـی یـد بـلالٍ وبـلالٌ بـاسـطٌ ثوبة یُلقی فیـه النّساءُ الـصـدقةَ قـلتُ لعطاءٍ: زَکوٰة یومَ الفطر؟ قالَ: لاولکن صدقةً یتـصـدّقْن حینئذٍ تُلقی فتنھا ویُلقن قلتُ أتریٰ حقاً علی الامام ذالک وَ یـذکّـرھـنّ؟ قـال: انّـه لـحقٌّ عـلیھـم ومَـالھم لا یفعلون. [۱۲]

عیدالفطر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور نماز پڑھائی۔ پہلے نماز پڑھائی پھر خطبہ دیا۔خطبہ سے فراغت ہوئی تو نیچے اتر آئے۔ پھر خواتین کے پاس آئے اور انھیں نصیحت کی۔آپ بلال کے ہاتھ پر ٹیک لگائے تھے اور بلال اپنے کپڑے کو پھیلائے ہوئے تھے جس میں عورتیں صدقہ کی چیزیں ڈال رہی تھیں۔ابن جریج کہتے ہیں: میں نے عطا سے پوچھا کیا وہ عیدالفطر کی زکوۃ تھی؟انھوں نے جواب دیا:نہیں وہ صدقہ تھا جو عورتیں اُس وقت کر رہی تھیں۔وہ انگوٹھیاں نکالتی تھیں اور کپڑے میں ڈال دیتی تھیں۔

میں نے پوچھا: آپ کی کیا رائے ہے، کیا امام پر واجب ہے کہ وہ عورتوں کو وعظ و نصیحت کرے؟ انھوں نے فرمایا: امام پر واجب ہے۔ اور وہ ایسا کیوں نہیں کریں گے؟

حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ امام بخاری کے باب کا عنوان بتاتا ہے کہ اُن کی رائے میں خواتین کی تعلیم و تذکیر صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تک محدود نہ تھی۔ اس سے پہلے کی حدیث میں صراحت ہے کہ اہل و عیال کی تعلیم و تذکیر مستحب ہے [۱۳] اور یہ حدیث بتاتی ہے کہ امام اور اس کے قائم مقام کے لیے بھی مستحب ہے کہ وہ خواتین کی تعلیم و تذکیر کرے۔ [۱۴]

عبدالحلیم ابو شقہ نے اس کے بعد ایک اور عنوان قائم کیا ہے: ''مردوں کا عورتوں سے علم حاصل کرنے کے دوران ملاقات کے واقعات'' اور اس کے بعد احادیث نقل کی ہیں۔ یہ ایک دلچسپ بحث ہے اس سے عہدِ نبوی کی معاشرتی زندگی میں مسلمان خواتین کی شرکت کے شواہد ملتے ہیں۔ فاضل مصنف یہ صراحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ''اُس وقت مردوں اور عورتوں کے درمیان سنجیدہ اور باوقار ملاقات ہی کا رواج تھا اور یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تھی۔'' وہ کہتے ہیں کہ ''ہمیں ایک بھی ایسا نص نہیں ملا جس میں شرعی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے مردوں اور عورتوں کی ملاقات کو ناپسند کیا گیا ہو۔'' البتہ علمائے اسلام کی آرا مختلف رہی ہیں۔ [۱۵]

مگر دورِ نبوی کے اِن واقعات کو آج کے مخلوط معاشرہ پر منطبق کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔ یہ فکر و نظر کی وہ تطہیر ہے نہ اسلامی آداب کی وہ رعایت ہے اور نہ احکام شریعت کی وہ تنفیذ ہے مگر خواتین کی اعلیٰ تعلیم سے محرومی کا متحمل بھی مسلمان معاشرہ نہیں ہوسکتا۔ تمام نزاکتوں اور شرطوں کی بھرپور رعایت رکھتے ہوئے خواتین تعلیم کے میدان میں آگے بڑھیں۔ یہ مسلمان اصحاب حل و عقد کی ذمہ داری ہے کہ وہ خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے معیاری ادارے قائم کریں اور اپنی توانائیاں اور وسائل اس منصوبہ بندی میں لگائیں۔

فقہی مسلک کا مخمصہ

اس سیاق میں دو سوالات اٹھائے گئے: پہلا: ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے مسلک پر عمل

کرنا درست ہے یا اپنی صواب دید کے مطابق کتاب وسنت سے راست استفادہ کرکے راہِ عمل متعین کرنا صحیح ہے؟ دوسرا: آپ نے فرمایا کہ عام انسانوں کو کسی ایک مسلک پر عمل کرنا چاہیے، مگر مسلک کوئی مکمل نہیں ہے۔ اس سے گمراہی کا خدشہ ہے۔ براہِ راست سنتِ رسول سے استفادہ پر آپ نے زور کیوں نہیں دیا؟

یہ دونوں سوال اُس فکری مخمصہ کی نشان دہی کرتے ہیں جس میں عام مسلمان مبتلا ہیں۔ تقلید یا کسی ایک فقہی مسلک کی پیروی کے سوا عام مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ مسلک اہلِ حدیث کے مطابق کتاب وسنت کی راست پیروی ہی صحیح مسلک ہے۔ مگر عام مسلمانوں کو کتاب وسنت کی تعلیمات سے راست واقفیت نہیں ہوتی وہ بھی کسی معتمد عالمِ دین کی تقلید کرتے ہیں جو انھیں کتاب وسنت کے احکام بتاتا ہے۔ اس اعتبار سے چاروں مکاتب فقہ اور مسلک اہل حدیث میں جوہری فرق نہیں ہے۔

اختلاف وفرق وہاں واقع ہوتا ہے جب کسی امام کے قول اور حدیث صحیح میں تضاد ہو اور دونوں میں تطابق کی کوئی صورت نہ ہو۔ حالاں کہ تمام ائمہ فقہ کی تاکید رہی ہے کہ کوئی صحیح حدیث مل جائے تو اُس کے قول کو ترک کرنا واجب ہے مگر یہ مسائل خالص علمی نوعیت کے ہیں اور علمائے دین اور فقہائے امت کے درمیان زیر بحث آتے ہیں۔ عام مسلمانوں کو کسی عالم دین یا امام فقہ کی رائے پر ہی عمل کرنا ہوتا ہے۔ اصولی طور پر ہر مسلمان کا یقین محکم ہونا چاہیے کہ صحیح حدیث پر عمل کرنا ایمان کی نشانی ہے خواہ اُس کی زد کسی فقہی مسلک پر پڑے۔

مسلک کوئی معلوم اور مکمل نہیں ہے، اصولی طور پر یہ موقف درست ہے۔ معلوم اور مکمل ذات صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ صرف آپ کا اسوہ قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے واجب الاتباع ہے۔ قرآن نے صراحت کر دی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيراً. (الاحزاب:۲۱)

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد

کرے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا یہ جذبہ بغیر کسی تنازعہ،ضعفِ ارادہ اور تنگ دلی وشتابی کے مطلوب ہے۔اس راہ میں صبر واستقامت اور پامردی وحوصلہ مندی درکار ہے۔قرآن نے اعلان کیا:

وَأَطِيعُواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَلاَ تَنَازَعُواْ فَتَفْشَلُواْ وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُواْ إِنَّ اللّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ. (انفال:۴۶)

اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہوجائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور اسوۂ حسنہ کی پیروی ہر مسلمان پر واجب ہے۔اس عقیدہ پر غیر متزلزل ایمان ہو تو کسی مسلک پر عمل کرنا اور کسی امام کی تقلید کرنا قابل اعتراض نہیں کیوں کہ کسی امام کی پیروی اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا مخلص ترجمان ہے۔البتہ اگر کسی مسئلہ میں حدیث وسنت سے تعارض لازم آئے تو اُس فقہی رائے کو ترک کرنا اور حدیث کو اختیار کرنا واجب ہے۔

البتہ جو متبحر عالم ہیں، دینی بصیرت اور تفقہ کی دولت سے مالا مال ہیں،علوم شریعت پر جن کی گہری نظر ہے اور اللہ نے انھیں اجتہاد واستنباط کی صلاحیت عطا کر رکھی ہے اُن کے لیے تقلید روا نہیں ہے۔اگر اِس تناظر کو سامنے رکھا جائے تو مختلف مسالک کے درمیان قربت پیدا ہوسکتی ہے اور یہی مطلوب ہے۔مسلکی شدت اور فقہی تصلت مناسب نہیں ہے دین کے نکتہ نظر سے بھی اور حکمت عملی کے اعتبار سے بھی۔

قوّام کا جدید انطباق

ایک خاتون کا سوال ملازمت سے متعلق تھا۔عورت کا دائرہ کار اُس کا اپنا گھر ہے اگر وہ ملازمت کرے یا تجارت کا پیشہ اختیار کرے،اُس کے بچوں کی تعلیم وتربیت متاثر ہوگی اور وہ اپنے دائرہ

عمل سے انصاف نہیں کر پائے گی۔

دوسری خاتون نے قوامیت کا مسئلہ اٹھایا۔ مرد عورتوں پر قوّام بنائے گیے ہیں۔ آج کے دور میں اگر عورت خود کفیل ہوجائے اور معاشی طور سے خود مکتفی ہوجائے تو مرد کی قوّامیت کے کیا معنی ہوں گے؟

اس اصطلاح کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اللہ نے فرمایا:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاء بِمَا فَضَّلَ اللّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُواْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّهُ. (النساء:۳۴)

یہ وہ آیت ہے جس پر دورِ جدید میں بڑی بحثیں ہوئی ہیں۔ خواتین کے معاشی طور پر خود کفیل ہوجانے کی صورت میں مرد کی قوامیت پر سوالیہ نشان قائم کیا ہے اور مرد اور عورت کے درمیان صنفی مساوات قائم کرنے کے لیے تجدد زدہ مصنفین نے اس آیت کی من مانی تاویل کی ہے۔ اس آیت کا ترجمہ ہے:

''مرد عورتوں کے نگراں اور سرپرست ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت ونگرانی میں اُن کے حقوق کی نگرانی کرتی ہیں۔''

اس آیت میں فضیلت شرف اور کرامت وعزت کے معنی میں نہیں ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور عزت وشرف سے دونوں کو ہم کنار کیا ہے۔ اس معنی میں دونوں صنف برابر ہیں۔ قرآن نے وضاحت کر دی ہے:

وَلَقَد كَرَّمنَا بَنِي آدمَ. (بنی اسرائیل:۷۰) ہم نے بنی آدم کو معزز ومکرم بنایا ہے۔[۱۶]

مرد کو عورت پر کُلّی فضیلت حاصل نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ مرد کو اللہ نے بعض خصوصیات ایسی عطا کی ہیں جو عورت کو نہیں دیں یا اُس سے کم دی ہیں۔ محافظت و مدافعت کی جو قوت یا

کمانے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی جو استعداد مرد کے اندر ہے وہ عورت کے اندر نہیں ہے۔ اسی طرح گھر سنبھالنے اور بچوں کی پرورش و پرداخت کرنے کی جو صلاحیت عورت کے اندر ہے وہ مرد نہیں رکھتا۔ قرآن کے اندر خطابت سے مرد اور عورت دونوں کا کسی نہ کسی پہلو سے صاحب فضیلت ہونا نکلتا ہے۔ مگر قوامیت کے پہلو سے مرد ہی کی فضیلت کا پہلو راجح ہے۔[۱۷]

اس آیت میں قوامیت کے دو اسباب بتائے گئے ہیں۔ ان دونوں میں قائم کردہ ترتیب بھی قابلِ غور ہے۔ پہلا اور اقدم سبب مرد کی عورت کے مقابلے میں فضیلت ہے جو طبعی وفطری ہے اور جسمانی بھی۔ قوتِ مدافعت ومحافظت فطری اور جبلّی طور پر مرد کے اندر زیادہ ہوتی ہے۔ انفاق کی خصوصیت وفضیلت دوسرے نمبر پر ہے۔ اگر عورت خود کفیل ہو جائے تب بھی فطری وجبلّی طور پر مرد کے مقابلے میں کمزور رہے گی اور قوامیت کی ذمہ داری ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکے گی۔

اس قرآنی ترتیب سے ایک اور حکمت آشکارا ہوتی ہے۔ کمانے اور معاشی بار اٹھانے کی ذمہ داری سے اللہ نے عورت کو علاحدہ کر رکھا ہے۔ اگر وہ خود کفیل ہے اور معاشی بار اٹھانے میں مرد کا تعاون کرتی ہے تو وہ رضا کارانہ طور پر اور بطور احسان وتبرع کرتی ہے اور اللہ کے ہاں اجر کی مستحق بنتی ہے، اسی لیے قوّام کی ذمہ داری سے اللہ نے اُسے مستثنیٰ رکھا ہے۔ تبرع اور احسان کے طور پر خدمت بجالانے کی بنیاد پر قانون نہیں بنتا ہاں اخلاقیات وفضائل سے اُس کا تعلق ضرور ہو جاتا ہے کہ گھر میں امن وسکون مرد وعورت کے باہمی تعاون سے اور قانون سے آگے بڑھ کر احسان وایثار کے رویہ سے ہی فروغ پاتا ہے۔

معاشرتی تنازعات اور ایثار

ایک خوبصورت سوال کسی طالبہ نے خاندانی تنازعات کے حل میں موثر کردار کے بارے میں اٹھایا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کلیۃ البنات کی طالبات اپنی سماجی ذمہ داریوں کے تئیں فکرمند ہیں۔

خاندانی اختلافات وتنازعات کو حل کرنے میں دو چیزیں مددگار ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ طویل مشاورت اور مسئلہ کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے اوقات کو فارغ کرنا اور صبر وتحمل سے ہر فریق کی شکایت کو سننا۔ عام طور سے ہمارے پاس دوسروں کے مسائل کو سننے اور اُن کی نزاکتوں کو سمجھنے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ ہم عجلت میں بے صبری سے کوئی فیصلہ بطور فتویٰ صادر کر دیتے ہیں جس سے

پیچیدگی بڑھ جاتی ہے۔صبر وسکون اور سنجیدگی کے ساتھ فریقین کی شکایات سننے سے ہی بہت سے مسائل حل ہوجاتے ہیں یا اُن کی حدت کم ہوجاتی ہے۔

۲۔ احسان وایثار کا رویہ۔دوسروں کی دل جوئی اور ناز برداری اور اپنے مفادات پر دوسروں کے مفادات کو ترجیح دینا نہایت کارگر نسخہ ہے تنازعات کو نمٹانے کا۔اس سے جھگڑوں کا تصفیہ ہی نہیں ہوتا، مخالفین کے دلوں پر قبضہ بھی ہوجاتا ہے۔قرآن نے عدل واحسان کا حکم دیا ہے۔اُس نے صلہ رحمی کی تاکید کی ہے۔عدل سے مراد لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن وتناسب اور ہر شخص کو اُس کا حق بے لاگ، دوسرے کا پاس ولحاظ، دوسرے کو اُس کے حق سے کچھ زیادہ دینا، اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہوجانا، یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اُس کا جمال اور اُس کا کمال ہے۔

صلہ رحمی کی تاکید کا فقط یہی مطلب نہیں ہے کہ ''رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ ہو، اُن کی خوشی وغمی میں برابر کی شرکت ہو بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحبِ استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے، بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔''[۱۸] اسی سے افرادِ معاشرہ میں معاشی خوشحالی، معاشرتی حلاوت اور اخلاقی طہارت کا بلند معیار پیدا ہوتا ہے۔قرآن نے حکم دیا:

> إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِيْ الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُون. (النحل:۹۰)
>
> ''اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم وزیادتی سے منع کرتا ہے۔وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ تم سبق لو۔''

مدینہ منورہ کے انصار کی یہی صفت تھی جس کی تعریف وتحسین خود قرآن نے کی ہے:

> وَلَا يَجِدُونَ فِيْ صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ. (الحشر:۹)

اور جو کچھ بھی اِن کو دے دیا جائے اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں
میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ
اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے
بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

شحِّ نفس کا مطلب ہے تنگ دلی، کم حوصلگی، بخل اور کنجوسی جو تمام معاشرتی فسادات کی جڑ ہے۔ یہ لفظ ایثار واحسان کی ضد ہے۔ اہلِ ایمان عدل واحسان اور ایثار سے متصف ہوتے ہیں اور اہلِ کفر شُحِّ نفس سے۔ رشتوں ناطوں کو بچانے اور صلہ رحمی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ترکیب یہی ہے کہ ہمارا رویہ ایثار وفیاضی کا ہو۔ دوسروں کے حقوق کی رعایت ہو خواہ اپنے حقوق سے دست کش ہونا پڑے۔

تفقہ فی الدین کو اولین ترجیح

ایک طالبہ کا سوال غیر مسلم اکثریت کے درمیان دین کی دعوت سے پہلو تہی کے تئیں تشویش اور فکر مندی کے حوالے سے تھا جب کہ مسلمانوں کی اصلاح پر ساری توجہ کی جاتی ہے۔

سوال بہت معقول تھا۔ میں نے تحسین کی۔ ہندوستان جیسے تکثیری معاشرہ میں ہندوؤں کے درمیان اسلام کے وسیع تعارف اور مسلمانوں کے سلسلے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی منصوبہ بند ملّی واجتماعی کوشش ہی اسلام کے مستقبل کا ضامن ہے۔ وحدت ومساوات اور تکریم انسانیت کے آفاقی پیغام کی مقامی زبانوں میں ترسیل اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کا عملی ثبوت اس ملک میں دعوتِ دین کا صحیح منہج ہے اور بہترین حکمتِ عملی بھی۔ مسلمانوں نے اس ملک پر آٹھ سو سال سے زیادہ حکومت کی۔ انھوں نے یہاں کی سیاست وتہذیب، ثقافت ومعاشرت، علوم وفنون اور تمدن کو ثروت مند بنایا۔ ہندوستانی مذاہب پر اپنے عقیدہ وفکر کے گہرے اثرات مرتب کیے مگر دعوتِ دین کی کوئی منظّم منصوبہ بندی نہ ہوئی اور نہ محروم ومظلوم طبقات کو آگے بڑھ کر گلے لگانے کی کوئی اجتماعی جدوجہد ہوئی۔

آزاد ہندوستان میں مسلمان اپنے قومی مسائل، تہذیبی تشخص اور دستوری وآئینی جدوجہد کے لیے سربکف رہے۔ ہندوؤں میں اسلام کی دعوت کا اجتماعی سطح پر تعارف نہ ہو سکا، نہ قومی سالمیت، سماجی ہم آہنگی اور فرقہ وارانہ وحدت کے قیام واستحکام کی منصوبہ بندی ہوئی۔ دینی جماعتیں، ملی

ادارے، مدارس اور خانقاہیں اصلاحِ معاشرہ پر اپنی ساری توجہ کرکے ملک کی اکثریت کے مسائل سے تقریباً بےفکر ہیں، اُن کی تحریروں، تقریروں اور منصوبوں کے مخاطب مسلمان ہیں۔

مدارس کے طلبہ وطالبات کے دوران طالب علمی اپنی تمام تر توجہات تفقہ فی الدین پر مرکوز رکھنا اولین ترجیح ہے تاکہ دینی بصیرت اور عصری ادراک کے ساتھ جب وہ تعلیم سے فارغ ہوں تو اصلاحِ معاشرہ اور دعوتِ دین کی بہتر منصوبہ بندی کرسکیں۔ ظاہری اور سطحی علم سے بالاتر ہوکر روحِ دین اور مقاصد شریعت کی گہرائیوں میں اُتر سکیں اور اجتہاد واستنباط کی صلاحیت سے مسلح ہوکر دین کی خدمت کرسکیں۔ قرآن کا اعلان ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُواْ كَآفَّةً فَلَوْلاَ نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِيْ الدِّيْنِ وَلِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُواْ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ. (التوبہ:۱۲۲)

اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہلِ ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جاکر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔

اس آیت میں تفقہ فی الدین اور انذار کے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ تفقہ کا مطلب ہے دین کا گہرا فہم حاصل کرنا، اُس کے مزاج، روح اور مقاصد سے آشنا ہونا، اُس کے نظام میں بصیرت حاصل کرنا تاکہ زندگی کے تمام معاملات میں روحِ دین کے مطابق طریقِ فکر وعمل اختیار کیا جاسکے۔ علم ظاہر اور شکل دین سے بلند ہوکر مقاصد واسرار شریعت کی تہ میں انسان اُتر سکے اور نئے حالات پر نصوصِ دین کا حکمت وفراست کے ساتھ انطباق کرسکے۔ طلب علم کا مرحلہ مکمل ہونے کے بعد وہ انذار وتذکیر میں لگ جائے کہ آیت قرآن کا مقصود یہی معلوم ہوتا ہے۔

ووٹ کی شرعی حیثیت

ایک طالبہ کا سوال ووٹ کی شرعی حیثیت کے بارے میں تھا کیوں کہ بعض علماء غیر مسلم

معاشرہ میں ووٹ دینے کو طاغوت کے ساتھ تعاون سمجھتے ہیں جو قرآنی حکم کے مطابق حرام ہے۔ قرآن نے صاف صاف کہہ دیا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّٰهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَی اللّٰهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلالَةُ فَسِيْرُواْ فِی الأَرْضِ فَانظُرُواْ کَيْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُکَذِّبِيْنَ (النحل:۳۶)

ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا اور اُس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔ اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی۔ پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

سوال اہم تھا۔ طالبات کی موجودہ سیاست سے دلچسپی قابلِ تحسین تھی۔ اندازہ ہوا کہ جمہوری ہندوستان میں ابھی ایسے علمائے دین موجود ہیں جو ملک کے سیکولر ڈھانچے اور دستوری و آئینی حیثیت کو طاغوت سمجھتے ہیں۔ میں نے جواب میں طاغوت کی تشریح کی۔ قرآن نے صراحت کر دی ہے کہ ایمان باللہ کے لیے کفر بالطاغوت ضروری ہے:

لاَ إِکْرَاهَ فِی الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَکْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَی لاَ انفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ٥ اللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَی النُّوُرِ وَالَّذِيْنَ کَفَرُواْ أَوْلِيَآؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَی الظُّلُمَاتِ أُوْلَـئِکَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُونَ. (البقرہ:۲۵۷-۲۵۶)

دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا

نہیں، اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں، اُن کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ اُن کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، اُن کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ انھیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے طاغوت کی جامع تشریح کی ہے:

''طاغوت لغت کے اعتبار سے ہر اُس شخص کو کہا جائے گا جو اپنی جائز حد سے تجاوم کر گیا ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے، جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ خدا کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں: پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اصولاً اُس کی فرماں برداری ہی کو حق مانے، مگر عملاً اُس کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اس کا نام فسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اُس کی فرماں برداری سے اصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اُس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے لگے۔ یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اُس کے ملک اور اُس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اِس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے، اُسی کا نام طاغوت ہے اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اِس طاغوت کا منکر نہ ہو۔''[19]

آزاد ہندوستان میں ملک کی دینی جماعتوں نے سیکولر اور ایمان دار افراد کو منتخب کرنے کے لیے ووٹ دینے کو واجب قرار دیا ہے۔ ووٹ کی حیثیت ایک گواہی کی ہے اور صاف اور سچی گواہی دینے کا قرآن نے حکم دیا ہے۔ کل ہند مسلم پرسنل لا بورڈ، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ، کل ہند ملی کونسل، جماعت اسلامی ہند، جمعیۃ العلماء، جمعیت اہلِ حدیث، علمائے اہلِ سنت، اسلامک فقہ اکیڈمی سب اسمبلی و پارلیمانی انتخابات کے وقت مسلمانوں سے اپنے شرعی حق کو استعمال کرنے کی تاکید اور درخواست کرتی

ہیں تا کہ دستور ہند کی پاسداری کرنے والے افراد اور جماعتیں اقتدار میں آسکیں۔ ووٹ دینے کا عمل ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس کے واجب ہونے میں اب کوئی اجتماعی اختلاف نہیں ہے۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے مضامین اور مولانا سید ارشد مدنی کے بیانات مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ جماعت اسلامی ہندی کی مجلس شوریٰ بھی اس معاملے میں یکسو ہے۔

حواشی وتعلیقات

۱۔ یہ گفتگو مرتب شکل میں اسلام اور عصر جدید (نئی دہلی) جلد: ۵۶، شمارہ: ۴، اکتوبر ۲۰۲۴ء میں شائع ہو چکی ہے۔ عنوان ہاے: حصولِ علم کے آداب (امام غزالیؒ کے افکار کا مطالعہ) ص: ۲۸-۳۵

۲۔ نصابِ تعلیم، جامعۃ الفلاح بلریا گنج (اعظم گڑھ) ۱۴۲۵ھ/۲۰۲۴ء

Website: www.jamiatulfalah.org

Email:jamiatulfalah1962@gmail.com

۳۔ **تفهيم القرآن** ـــــ سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) جلد: ششم، مارچ ۲۰۱۷ء، ص: ۳۸۷، حاشیہ: ۳

۴۔ **تدبر قرآن** ـــــ امین احسن اصلاحی، فاران فاؤنڈیشن (لاہور) جلد: ہشتم، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء، ص: ۴۳۸، فاضل مفسر کہتے ہیں کہ تقویم کا لغوی مفہوم ہے کسی چیز کو سیدھا کرنا۔ ہم عربی میں کہیں گے **قوّمتُ الرّمح فاستقام** (میں نے نیزے کو سیدھا کیا تو وہ سیدھا ہو گیا) پھر اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی شئ کو کسی خاص مقصد کے لیے موزوں اور مناسب بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۵۔ **حجاب المرأة المسلمة في الكتاب والسنة، لجنة الشباب المسلم** ـــــ محمد ناصر الدین الساعاتی الالبانی، **المطبعة السلفية** (قاہرہ) ۱۳۷۴ھ ص: ۴

۶۔ اردو میں علامہ البانی کے موقف کی وضاحت اور دلائل کے لیے دیکھیے میری کتاب "**تہذیب حجاب اور خواتین**"، پبلی کیشنز، ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء، ص: ۶۵-۱۹

۷۔ **چهرے کا پرده– مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور شیخ محمد ناصر البانیؒ کی آراء ومباحثات**" ـــــ محمد رضی الاسلام ندوی، ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز (نئی دہلی) ۲۰۲۳ء، ص: ۱۶-۸

۸۔ **تحرير المرأة في عهد الرسالة** ـــــ عبد الحلیم محمد ابوشقہ، تخلیص: ڈاکٹر محمد کبیسی، ترجمہ: شعبہ حسنین ندوی،

"خواتین کی آزادی عہدِ رسالت میں" المعہد العالی للفکر الاسلامی، ہرنڈن، ورجینیا (امریکہ) صفحات بڑی تقطیع میں: ۲۰۱

۹۔ مقاصد شریعت (نظرثانی شدہ اڈیشن) ـــــ محمد نجات اللہ صدیقی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) دسمبر ۲۰۱۷ء، ص: ۵۷-۵۶

۱۰۔ مولانا مودودی حیاۃ طیبةً کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ایمان اور عمل صالح، سچائی، دیانت اور پرہیزگاری کی روش انسان کی آخرت بھی بناتی ہے اور دنیا بھی۔ ایمان دار اور خدا ترس انسانوں کی زندگی بے ایمان اور بدعمل لوگوں کے مقابلے میں صریحاً بہتر رہتی ہے۔ عزت وسرخ روئی۔ کردار کی مقبولیت، قلب کا اطمینان اور ضمیر کی ٹھنڈک اُنہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو قول وفعل میں کھرے اور سیرت میں بے داغ ہوتے ہیں۔ تفھیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) مارچ ۲۰۱۷ء، جلد: دوم، ص: ۵۷۰، حاشیہ ۹۹

۱۱۔ **الجامع الصحیح، کتاب المعلم، باب عظمة الامام النسآء وتعلیمھن** ـــــ محمد بن اسماعیل البخاری، حدث: ۹۸

۱۲۔ **الجامع الصحیح، کتاب العیدین، باب موعظة الإمام السناء یوم العید** ـــــ محمد بن اسماعیل البخاری، حدیث: ۹۷۸

۱۳۔ اشارہ ہے اُس حدیث کی طرف جو امام بخاری نے کتاب العلم میں باب **تعلیم الرجل أمته و أھله** میں حدیث: ۹۷ کے تحت رقم کی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> **ثلاثة لھم اجرانِ رجلٌ من اھل الکتاب آمن بنبیهٖ و آمن بحمدٍ صلی اللّٰہ علیه وسلم، والعبدُ المملوک إذا أدّیٰ حق اللّٰہ وحق موالیهٖ ورجلٌ کانتب عنده امةٌ فأدّبھا فأحسنَ تادیبَھا وعلّمھا فأحسن تعلیمَھا ثمَّ أعتقما فتزوّجَھا فَک اجرانِ.**
>
> تین قسم کے لوگ ہیں جنھیں دوہرا اجر ملے گا۔ ایک اہل کتاب سے تعلق رکھنے والا فرد، جو اپنے نبی پر ایمان لائے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی۔ دوسرا غلام جو اللہ کا حق ادا کرے اور اپنے آقا کا حق بھی، تیسرا وہ شخص جس نے اپنی لونڈی کو ادب سکھایا اور حسنِ ادب کا سلیقہ بتایا۔ اُسے تعلیم دی اور اچھی تعلیم دی۔ پھر اُسے آزاد کر کے اُس سے شادی کر لی تو اُس کے لیے بھی دوہرا اجر ہے۔

۱۴۔ خواتین کی آزادی عہدِ رسالت میں ـــــ عبدالحلیم ابوشقہ، حوالہ بالا ص: ۲۵۹-۲۵۸

۱۵۔ نفسِ مصدر، ص: ۲۳۰

۱۶۔ تدبرِ قرآن —— امین احسن اصلاحی، انجمن خدّام القرآن (لاہور) جلد: دوم، ستمبر ۱۹۷۶ء، ص: ۶۴-۶۳

۱۷۔ تکریم انسانیت اور اسلام —— عبیداللہ فہد فلاحی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) مئی ۲۰۱۸ء، ص: ۲۶۴

۱۸۔ تفہیم القرآن —— سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) مارچ ۲۰۱۷ء، جلد: دوم، ص: ۵۶۶-۵۶۵، حاشیہ: ۸۸ سورہ النحل آیت: ۹۰ کی تشریح میں فاضل مفسر نے **فحشاء، منکر اور بغی** کی بڑی خوبصورت وضاحت کی ہے۔ عدل، احسان اور صلہ رحمی کا حکم دینے کے ساتھ اللہ نے اِن تین برائیوں سے منع کیا ہے۔ یہ انفرادی حیثیت سے افراد کو اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کر دیتی ہیں۔ **فحشاء** سے تمام بیہودہ اور شرمناک افعال مراد ہیں۔ منکر ہر وہ برائی ہے جسے تمام معاشرے اور آسمانی کتابیں منع کرتی ہیں اور بغی کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔ نفس مصدر، ص: ۵۶۶، حاشیہ ۸۹

۱۹۔ تفہیم القرآن —— سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) مارچ ۲۰۱۷ء، جلد اول، ص: ۱۶۷-۱۹۶، حاشیہ: ۲۸۶

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی *

اسلام میں وقف کا تصور اور سماجی کردار

وقف کا تصور اور آغاز

'وقف' کا نظام ایک ایسا انقلابی تصور ہے جو دنیا میں پہلی مرتبہ اسلام کے ذریعہ سامنے آیا، اور اس نظام نے سماج کی ہمہ جہت ترقی اور متنوع ضروریات کی تکمیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وقف کے تصور کا آغاز عہد نبوی میں ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے اللہ کے گھر کی تعمیر کرنی چاہی، اور اس کے لیے ایک متعین زمین اس کے مالکان کو قیمت ادا کر کے خریدی اور اس جگہ' کو 'وقف' کرتے ہوئے مسجد تعمیر فرمائی۔ یہی وقف وہ مسجد نبوی ہے جو آج دنیا میں مسلمانوں کا دوسرا مقدس ترین مقام اور حرم ثانی ہے۔[1] یہ پہلا وقف تھا جو مسجد کی تعمیر کے لیے کیا گیا، اور اس کی زمین بہ قیمت خریدی گئی اور وقف کر کے اس کی ملکیت اللہ کے لیے بنادی گئی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ دوسرا وقف قائم کیا گیا۔ اس کی تقریب یوں ہوئی کہ مخیریق نام کے ایک نیک صفت یہودی نے مسلمانوں کی جانب سے جنگ احد میں حصہ لیا اور یہ وصیت کی کہ اگر میں مارا جاؤں تو میرے سات باغوں کے سر پرست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے، وہ جہاں چاہیں ان باغات کا استعمال کریں۔ وہ یہودی جنگ میں مارا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باغات کو

* پروفیسر اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد ای میل: fanadvi@gmail.com

صدقات کے کاموں کے لیے وقف فرما دیئے۔[۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دو اوقاف کے علاوہ، عہد نبوی میں دو وقف اور ہوئے جو اسلامی تاریخ میں بہت مشہور ہیں۔ ایک 'رومہ' نامی کنواں کا وقف ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے وقف کیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ مدینہ میں مسلمانوں کو میٹھا پانی بہت مشکل سے دستیاب تھا۔ مدینہ میں میٹھے پانی کا ایک ہی کنواں 'بئر رومۃ' تھا، جو ایک یہودی کی ملکیت میں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے اپیل فرمائی کہ جو شخص اس کنویں کو خرید کر مسلمانوں کے لیے عام کر دے اللہ اس کو جنت میں بہتر اجر عطا فرمائے گا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے پیسے سے وہ کنواں آدھا خریدا اور اس کو مسلمانوں کے لیے عام کر دیا۔[۳]

دوسرا مشہور وقف حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہے، اور اسی وقف کے ذریعہ وقف کے اصول وضوابط مقرر ہوئے، اور وقف کا انقلابی تصور سامنے آیا۔ حدیث شریف میں اس وقف کا ذکر درج ذیل الفاظ میں آیا ہے:

عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنهما: أن عمر بن الخطاب أصاب أرضاً بخيبر، فأتى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم يستامره فيها، فقال: يا رسول اللّٰه، اني أصبت أرضاً بخيبر لم أصب مالاً قط أنفس عندي منه، فما تامر به؟ قال: 'ان شئت حبست أصلها، وتصدقت بها'، قال: فتصدق بها عمر، أنه لا يباع ولا يوهب ولا يورث، وتصدق بها فى الفقراء، وفي القربى، وفي الرقاب، وفي سبيل اللّٰه، وابن السبيل، والضيف، لا جناح على من وليها أن ياكل منها بالمعروف، ويطعم غير متمول.

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر کی ایک زمین ملی، تو انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے خیبر کی ایک زمین ملی ہے، اس سے عمدہ مال مجھے کبھی

نہیں ملا، میں اس کو کہاں خرچ کروں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر چاہو تو اس کی اصل کو باقی بنا دو اور اس کا نفع صدقہ کر دو۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس شرط کے ساتھ صدقہ کر دیا کہ وہ زمین نہ فروخت کی جائے گی، نہ ہبہ میں دی جائے گی، نہ اس میں میراث چلے گی، اور اس کے منافع فقراء، قرابت دار، غلام، راہ خدا، مسافرین اور مہمانوں پر خرچ کئے جائیں گے، اور جو اس زمین کا سرپرست ہوگا وہ اس میں سے صرف مناسب مقدار میں کھا سکتا ہے، لیکن اس سے دولت نہیں جمع کر سکتا ہے۔[۴]

اس نبوی ہدایت کی روشنی میں وقف کا ایک نیا اور انقلابی تصور سامنے آیا، وہ یہ تھا کہ وقف کی جانے والی زمین کی اصل باقی رہے گی اور وہ اللہ کی ملکیت میں چلی جائے گی، لہٰذا اس زمین کی خرید وفروخت، اس پر میراث یا اس کو ہدیہ میں دینے کی گنجائش نہیں رہے گی، البتہ اس کے منافع ہمیشہ خرچ کئے جاتے رہیں گے، اور یہ منافع ان جگہوں اور مدات میں خرچ کئے جائیں گے جن کی تعیین وقف کرنے والا شخص کرے گا۔

وقف کا یہ تصور عام قسم کے خیرات اور صدقات سے الگ تھا، کیونکہ صدقہ وخیرات اور مالی تعاون کی عام شکلوں میں دیا گیا سامان استعمال ہو کر ختم ہو جاتا ہے، یا وہ سامان لینے والے کی ذاتی ملکیت ہو جاتا ہے۔ لیکن وقف کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اصل سامان دائمی طور پر باقی رہتا ہے، اور اس کی منفعت سماج کے ان طبقوں تک پہنچتی رہتی ہے جن کی تعیین کر دی گئی ہوتی ہے۔ پس وقف میں:

۱۔ وقف کی گئی اصل پراپرٹی باقی رہتی ہے۔

۲۔ اس پر انسانی ملکیت ختم ہو جاتی ہے، اور اللہ کی ملکیت قائم ہو جاتی ہے۔

۳۔ اس میں تجارت، ہدیہ اور میراث جاری نہیں ہوتی ہے۔

۴۔ اس کے منافع متعینہ مدات پر خرچ ہوتے رہتے ہیں، اور خرچ کا تسلسل جاری رہتا ہے۔

انسانیت کے لیے خرچ

قرآن کریم نے اللہ کی دی ہوئی دولت میں سے اللہ کے بندوں پر خرچ کرنے کا بار بار حکم دیا

ہے اور خرچ کرنے پر بڑے اجر وثواب کی بشارتیں سنائی ہیں۔[۵] ایک آیت میں اللہ کا ارشاد ان الفاظ میں آیا ہے:

''انفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ''۔[۶]

(اس مال میں سے خرچ کرو جس کا اللہ نے دوسروں کے بعد تم کو مالک بنایا ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی پوری فیاضی کے ساتھ اللہ کے بندوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کیا۔ بخاری شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے:

''کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اجود الناس بالخیر، وکان اجود ما یکون فی رمضان''۔[۷]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے، اور آپ کی سخاوت رمضان میں سب سے زیادہ ہو جاتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بتایا کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، لیکن تین راستوں سے اس کے ثواب کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے، ایک علم نافع، دوسرے اولاد صالح جو اس کے لیے دعا کرے، تیسرے صدقہ جاریہ، یعنی ایسا صدقہ جس کا نفع جاری رہے۔[۸] صدقہ جاریہ کی بہترین شکل یہ وقف ہے، جس کی منفعت ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

اسلام کے اس نظام وقف کے تحت دنیا کے ہر خطہ میں اور ہر مسلم آبادی میں مسجدیں قائم ہیں، یہ مسجدیں اللہ کا گھر، اللہ کی ملکیت اور اللہ کی عبادت کا ایسا مقام ہوتی ہیں جہاں ہر بندۂ مومن بلا کسی روک ٹوک، اور مساوی حیثیت میں حاضر ہوتا ہے اور شاہ وگدا ایک صف میں کھڑے ہو کر شکر الٰہی بجا لاتے ہیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا، اور نہ کوئی بندہ نواز

وقف کا رواج

وقف کی اہمیت اور فضیلت کی وجہ سے مسلم سماج میں بڑے پیمانہ پر اس کا رواج قائم ہوا۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دور صحابہ میں بیشتر صحابہ نے وقف قائم کئے۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ

عنہ کہتے ہیں:

فما أعلم أحداً كان له مال من المهاجرين و الانصار الا حبس مالا من ماله صدقة مؤبدة، لاتشترى ابداً و لا توهب و لا تورث.[9]

حضرت جابر کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی بھی مہاجر یا انصاری صحابی جس کے پاس مال ہو اس نے دائمی وقف نہ کیا ہو، جسے نہ بیچا جائے گا، نہ ہدیہ کیا جائے گا، اور نہ اس میں میراث ہوگی۔

اس طرح ہر دور میں وقف کرنے کا سلسلہ چل پڑا، اور اہل خیر نے وقف کے مقاصد طے کرتے ہوئے سماج کی متنوع ضروریات کی تکمیل کی۔ اسلام کی تاریخ وقف کے روشن کارناموں اور مثالوں سے آراستہ ہے، اور تاریخ کے صفحات وقف کی مثالوں سے بھری ہیں۔

مقاصد واقف

وقف کے نظام کا ایک اہم عنصر مقاصد واقف کی پابندی ہے، یعنی واقف نے وقف کے منافع کو خرچ کرنے کے لیے جن مصارف کو متعین کیا ہے ان پر ہی وقف کی آمدنی خرچ ہوگی۔ اسلامی شریعت میں اس پابندی کی اتنی اہمیت ہے کہ اسلامی قانون کے ماہرین فقہاء کرام کے نزدیک اسے '**شرط الواقف كنص الشارع**' قرار دیا گیا، یعنی جس طرح شریعت کے نص کی پابندی ضروری ہوتی ہے، اسی طرح واقف کی شرائط کی پابندی ضروری ہوگی۔[10] اس وجہ سے ہر وقف کے ساتھ اس کے مصارف متعین کئے جاتے رہے ہیں۔ مسلمانوں نے وقف کے مقاصد متعین کرتے ہوئے ایسے ایسے نئے تصورات اور سماجی ضروریات کو پیش نظر رکھا جو مسرت افزا اور باعث حیرت واستعجاب ہیں، اور اس میدان میں ان کی وسعت نظری اور فراخدلی حیران کن نظر آتی ہے۔ سماج کی کون سی ایسی انفرادی یا اجتماعی ضرورت ہوگی جس کی تکمیل کے لیے مخصوص وقف قائم نہ کیا گیا ہو۔ ذیل کی سطور میں ہم دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں کن کن مقاصد کے لیے وقف قائم کرنے کا رواج رہا ہے۔

اسلام کی تاریخ میں مختلف مقاصد اور کاموں کے لیے وقف قائم کیے جانے کی ان گنت مثالیں ملتی ہیں۔ تعلیم وتربیت، علمی ریسرچ وتحقیق، علاج ومعالجہ، مسافروں کے قیام وطعام، پانی کی فراہمی، غریب خواتین کی شادی، غریبوں کے لیے تکفین وتدفین، مزدوروں اور غلاموں کی مالی اعانت، قیدیوں کی رہائی وغیرہ جیسے متنوع کاموں کے لیے بڑے بڑے اوقاف کے قیام اور ان کے بہترین نظم و انتظام کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ایسی چند مثالوں کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

الف۔ علاج اور طبی خدمات کے لیے اوقاف

سماج کی ایک اہم ضرورت طب وعلاج ہے، موجودہ وقت میں علاج نہ صرف پے چیدہ بلکہ گراں بھی ہوگیا ہے، جس کی وجہ سے غریبوں کے لیے علاج کی سہولت آسان نہیں رہ گئی ہے، اسلامی تاریخ میں علاج ومعالجہ کے لیے اسپتال قائم کرنے اور عام مریضوں بالخصوص غریب مریضوں کو تمام ضروری سہولتیں فراہم کرنے کے اوقاف کی شاندار مثالیں ملتی ہیں۔ مختلف مسلم حکومتوں کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہے کہ حکمرانوں اور اہل خیر نے بیمارستان اور شفا خانے بنائے اور انھیں اس طرح وقف کر دیا کہ وہاں ضرورت مندوں اور غریبوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا اور ان کی دیگر ضروریات مفت فراہم کی جاتی تھیں۔ عام اسپتالوں کے علاوہ الگ الگ امراض کے لیے بھی مخصوص طور پر جائدادیں وقف کی جاتی تھیں۔ ابن الاثیر نے اپنی تاریخ 'الکامل' میں لکھا ہے کہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک (متوفی: ۹۶ھ) نے دمشق میں ایک بیمارستان بنوا کر اسے وقف کر دیا تھا۔ اسی طرح جذام کے مریضوں کے لیے خصوصی طور پر اس نے ایک وقف قائم کیا تھا جس کی آمدنی ان مریضوں پر خرچ ہوتی تھی۔ اسی طرح ہر معذور کے لیے ایک خادم اور ہر نابینا کے لیے ایک رہنما فراہم کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔[۱۱]

اسپتال کا قیام اور ان پر وقف کرنے کی روایت عہد عباسی میں اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی، عباسی حکمرانوں کے قائم کردہ اسپتالوں میں وقت کے بڑے ماہر اطباء علاج اور تدریس کے لیے بلائے گئے تھے، چنانچہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (متوفی: ۱۵۸ھ) نے مشہور عیسائی طبیب جورجیس بن بخت یشوع جندیساپوری کو بغداد بلوایا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ دارالخلافہ کے اسپتالوں میں طب کی تعلیم دے اور مریضوں کو علاج فراہم کرے۔[۱۲] اسی طرح عباسی حکومت نے جندیساپور کے مشہور طبیب سابور بن

سہل (متوفی:۲۵۵ھ) کی کتابیں خرید کر اسپتالوں کے کتب خانوں میں وقف دی تھیں، تاکہ طب کے طلبہ ان سے استفادہ کریں۔ اس کی مشہور کتاب 'اقراباذین'، اسی طور پر بغداد کے اسپتال میں آئی تھی۔[۱۳]

بویہی حکومت کے فرمانروا عضد الدولہ کا وقف کردہ بیمارستان عضدی' جو بغداد میں ۳۶۶ھ میں قائم ہوا تھا' اتنا بڑا اور معیاری تھا کہ وہاں بہ یک وقت ۲۴ اطباء الگ الگ شعبوں میں کام کرتے تھے۔ عضد الدولہ نے اس اسپتال کے اخراجات کے لیے بہت زیادہ وقف قائم کر رکھے تھے، اس میں تمام شہریوں کے لیے علاج مفت تھا، مریضوں کو ہر طرح کی سہولت فراہم کی جاتی اور ان پر توجہ دی جاتی تھی، انھیں پہننے کے لیے نئے کپڑے دیئے جاتے، ان کو متنوع عمدہ غذائیں فراہم کی جاتیں اور ان کے لیے مطلوبہ تمام ضروری دوائیں مہیا کی جاتی تھیں، اور جب مریض شفایاب ہو جاتا تو گھر لوٹتے وقت ان کو سفر کے اخراجات بھی دیئے جاتے تھے۔[۱۴]

اس طرح کے معیاری اسپتال اور ان پر وقف اسلامی مملکت کے مختلف بڑے شہروں میں قائم کئے گئے تھے۔ مصر کے گورنر احمد بن طولون نے ۲۵۹ھ میں مصر میں بیمارستان قائم کیا تھا اور اس پر کئی بازار اور مکانات وقف کئے تھے، اور بیمارستان کے وقف نامہ میں یہ شرط لکھوائی تھی کہ اس میں صرف غریبوں اور عام شہریوں کا علاج ہوگا، کسی فوجی کا علاج نہیں ہوگا۔ اس اسپتال کے ساتھ اس نے دو حمام بھی بنوائے تھے، ایک مردوں کا حمام اور دوسرا عورتوں کا حمام۔ اس کی شرط یہ بھی تھی کہ یہاں آنے والے مریضوں کو صبح وشام عمدہ کھانا دیا جائے، مریض جب داخل ہوں تو ان کے اپنے کپڑے جمع کرا لیے جائیں اور انھیں نئے کپڑے اور نئے بستر فراہم کئے جائیں، اور جب مریض شفایاب ہو کر واپس جانے لگیں تو ان کے اپنے کپڑے واپس کر دئے جائیں اور سفر کے اخراجات بھی دیئے جائیں۔ خود احمد بن طولون براہ راست اس اسپتال کی سہولیات کی نگرانی کے لیے ہر جمعہ کو یہاں آتے تھے اور جائزہ لیا کرتے تھے۔[۱۵]

اسپتالوں کی شہری خدمات کے ساتھ دور دراز کے دیہی علاقوں میں موبائیل طبی خدمات بھی فراہم کی جاتی تھیں اور ان کا انتظام وقف سے ہوتا تھا، چنانچہ مشہور مؤرخ ابن ابی اصیبعہ (متوفی:۶۶۸ھ) نے لکھا ہے کہ بغداد کے اسپتالوں کے ڈائرکٹر سنان بن ثابت بن قرہ کو گورنر کی طرف سے یہ حکم نامہ صادر ہوا تھا کہ اطباء کی ایک ٹیم مواضعات کے اندر میڈیکل کیمپس لگائے، اس کے لیے

ایک گاؤں میں بقدرِ ضرورت چند ایام تک ٹھہر کر وہاں کے مریضوں کا علاج کرے اور مفت دوا فراہم کرے، پھر دوسرے گاؤں منتقل ہو، اور وہاں ٹھہر کر میڈیکل کیمپ لگائے۔ چنانچہ سنان یہ کام انجام دیا کرتا تھا۔ ان گاؤں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کو مفت طبی خدمات فراہم کی جاتی تھیں، نیز انسانوں کے علاوہ بیمار جانوروں کا بھی علاج کیا جاتا تھا۔[۱۶]

نور الدین زنگی (متوفی: ۵۶۹ھ) نے بھی اپنی مملکت کے شہروں میں ایسے اسپتال قائم کر رکھے تھے، اور ان کے اخراجات کے لیے بڑے بڑے وقف متعین کر دیئے تھے، دمشق کا مشہور 'نوری اسپتال' ۵۴۹ھ میں نور الدین زنگی نے قائم کر کے صرف فقراء اور مساکین کے علاج کے لیے پورا اسپتال وقف کر دیا تھا، مالدار لوگ صرف مجبوری میں جب دوا کہیں اور فراہم نہ ہو' تب ہی یہاں علاج کرا سکتے تھے۔ یہ 'نوری اسپتال' دنیا کے مشہور اور بہترین اسپتالوں میں ایک تھا، جو ۱۸۹۹ء تک تقریباً آٹھ سو برس کام کرتا رہا تھا۔۔ اسی معیار کا ایک اسپتال 'بیمارستان نوری' حلب کے شہر میں قائم کیا گیا تھا جس پر متعدد گاؤں اور دیگر جائیدادیں وقف کی گئی تھیں۔[۱۷]

صلاح الدین ایوبی (متوفی: ۵۸۹ھ) کے دور میں بھی ایسے اسپتال متعدد شہروں میں قائم ہوئے، چنانچہ اس کے حکم پر قاہرہ کے ایک شاندار محل میں 'بیمارستان صلاحی' بنایا گیا جس پر بڑی بڑی جائیدادیں اس نے وقف کیں؛ اس اسپتال میں اطباء، سرجن اور ماہرین امراض چشم کے علاوہ پورا عملہ اور خدام مقرر کئے گئے تھے۔ مشہور سیاح ابن جبیر (محمد بن احمد بن جبیر اندلسی متوفی: ۶۱۴ھ) نے اس اسپتال کو دیکھا اور اس کی عمارت کے حسن و جمال اور اسپتال کے انتظام و معیار پر انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔ ابن جبیر نے لکھا ہے کہ اس اسپتال میں مردوں کے لیے الگ اور عورتوں کے لیے الگ مخصوص وارڈز ہیں، اسی طرح دماغی امراض کے لیے الگ وارڈ ہے، اور نفسیاتی امراض کے لیے علاحدہ حصہ ہے، عورتوں کے وارڈ میں خدمت گار عورتیں مقرر ہیں۔[۱۸]

موحدین حکومت کے فرمانروا یعقوب بن یوسف بن عبد المومن (متوفی: ۵۶۴ھ) نے مراکش میں بہت خوبصورت اور معیاری اسپتال قائم کیا تھا، اس اسپتال کی تعمیر کھلے مقام پر انتہائی پر کشش اور پر فضاء ماحول میں اس طرح کی گئی تھی کہ ہر طرف درختوں کی قطاریں تھیں اور خوبصورت تالاب بنے ہوئے تھے۔ اسپتال کے احاطہ میں ہر قسم کی ادویہ تیار کی جاتی تھیں، مریضوں کو لباس اور

غذاء کی معیاری سہولیات مفت فراہم کی جاتیں اور مریض شفایاب ہو کر واپس جانے لگتے تو انھیں آئندہ زندگی کے لیے ایک معقول رقم فراہم کی جاتی تھی۔ اس اسپتال میں غریبوں اور امیروں دونوں کا علاج مفت ہوتا تھا، اور مراکش کے باہر سے آنے والوں کو بھی یہاں مفت علاج ملتا تھا۔ اور ان تمام انتظامات کی دیکھ ریکھ کے لیے ہر جمعہ کو نماز کے بعد امیر حکومت خود تشریف لاتے اور مریضوں سے حال احوال دریافت کرتے تھے۔[۱۹]

دور مملوکی میں سلطان منصور قلاؤن نے ۶۸۳ ہجری میں قاہرہ میں ایک شاندار اور معیاری اسپتال 'بیمارستان منصوری' تعمیر کرایا اور اس کے اخراجات کے لیے کافی زیادہ جائدادیں وقف کی تھیں۔ مشہور مؤرخ ابن تغری بردی (جمال الدین یوسف بن سیف الدین تغری بردی متوفی ۸۷۴ھ) نے اپنی تاریخ میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''یہ بیمارستان، اس کے اوقاف اور اس کے نظم و انتظام کی شرائط ایسی ہیں کہ مشرق و مغرب میں کبھی بھی قدیم یا جدید وقت میں ایسا کسی نے نہیں بنایا ہوگا۔''[۲۰] مملوک دور کے مشہور طبیب ابن نفیس (علی بن ابی الحزم قرشی دمشقی، متوفی: ۶۸۷ھ) نے اپنی وفات کے وقت اپنی تمام قیمتی طبی کتابیں قاہرہ کے اسی بیمارستان منصوری کو وقف کر دی تھیں، جن میں اس کی طبی زندگی کی زائد از ۶۲ سالہ تجربات کا خلاصہ محفوظ تھا۔[۲۱] اسی منصور قلاؤن نے قدس فلسطین میں بھی ایسا ہی ایک بیمارستان ۶۸۰ھ میں قائم کر کے اس پر بے شمار آمدنی والے اوقاف مقرر کئے تھے۔ ایک اسپتال مملوک امیر سیف الدین قیمری نے دمشق کے جبل قاسیون کے دامن میں قائم کیا تھا۔[۲۲]

خلافت عثمانیہ کے زمانہ میں بھی ان اسپتالوں کی دیکھ ریکھ اور ان پر وقف کرنے کا تسلسل جاری رہا، چنانچہ قاہرہ کے بیمارستان منصوری اور دمشق کے بیمارستان نوری اور بیمارستان قیمری کے نظم و انتظام پر اس دور میں بہت توجہ دی گئی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی (متوفی: ۱۹۶۴ء) نے لکھا ہے کہ عہد عثمانی میں طرابلس الشام میں ایک وقف اس مقصد کے لیے خاص تھا کہ اس کی آمدنی سے دو افراد ملازم رکھے جائیں جو روزانہ اسپتال میں جا کر مریضوں کے قریب کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ ان سے باتیں کریں؛ تاکہ مریض کے چہرہ پر خوشی آئے اور ان کی آنکھوں میں مسرت کی چمک لہرے۔ اسی طرح کچھ اوقاف جانوروں کے علاج اور ان کی دیکھ بھال کے لیے قائم کئے گئے تھے۔[۲۳]

ب۔ پینے کے پانی، نہر اور پلوں کے لیے وقف

پانی انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ پینے کے پانی کی فراہمی، نہروں کی کھدائی اور سبیل کا انتظام، اسی طرح پانی کی دیگر ضروریات کی فراہمی جیسے کاموں کے لیے وقف قائم کرنے کی بہترین مثالیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ عہد نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے پیسہ سے مدینہ کے واحد میٹھے پانی کے کنویں 'بئر رومہ' کا نصف حصہ خریدا تھا اور اس کا پانی سارے مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ خلفائے بنی امیہ نے مملکت کے تمام علاقوں میں نہروں کی کھدائی اور گھروں تک پانی کی ترسیل کا انتظام کیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بصرہ میں نہر کھدوائی تھی۔ ہشام بن عبدالملک نے دمشق کے قریب ایک گاؤں 'حرستا' میں نہر بنوایا تھا۔[۲۴] اسی طرح یزید بن عبدالملک نے بصرہ والوں کے لیے نہر بنانے کا حکم دیا تھا۔ مؤرخ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ایسے ۱۹ پانی کے نلوں کا ذکر کیا ہے جو دمشق کے مختلف حصوں میں پینے کے پانی کے لیے بنا کر وقف کئے گئے تھے، اور ان کی صفائی اور انتظام کے لیے علاحدہ وقف کئے گئے تھے۔[۲۵]

ایسے کار خیر کے لیے وقف کے کاموں میں مردوں کے شانہ بہ شانہ خواتین بھی پیش پیش تھیں۔ چنانچہ مشہور خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی سیدہ زبیدہ نے بے شمار وقف قائم کئے تھے جن میں کنویں اور نہریں تیار کرانے کے کام بھی شامل تھے۔ اس نے مکہ و مدینہ کے مقدس شہروں تک پانی پہنچانے کے لیے مشہور نہر زبیدہ بنوایا تھا جو پہاڑوں اور وادیوں کو چیرتے ہوئے بارہ میل کے فاصلہ سے مکہ تک لایا گیا تھا، اور اس پر اس نیک صفت خاتون نے ۱۷/لاکھ دینار خرچ کئے تھے۔[۲۶]

ذہبی نے تاریخ اسلام میں ذکر کیا ہے کہ ایوبی دور میں الملک الکامل نے قاہرہ میں بہت دور سے لاکر پینے کے پانی کا حوض بنوایا تھا۔[۲۷] اسی طرح اس دور میں مختلف مدارس، مساجد اور شفا خانوں کے ساتھ پینے کے پانی کی سبیلیں بنوا کر وقف کی گئی تھیں۔ ایوبی دور میں تقریباً ہر شہر میں مساجد، مدارس اور شاہراہوں پر پانی کی سبیلیں اور حوض بنوانے کا رواج عام تھا۔ اسی طرح مملوک دور میں پانی کی سبیلوں کا بہت عمدہ اور وسیع نظام قائم کیا گیا تھا، اور اس کے لیے بہت قیمتی اوقاف بنائے گئے تھے۔ یہ سبیلیں، مساجد، مدارس اور دیگر عمارتوں سے ملحق بھی بنائی جاتی تھیں اور علاحدہ مستقل طور پر بھی بنائی جاتی تھیں۔

ان سبیلوں کی تعمیر میں انجنیئرنگ کی مہارتیں استعمال کی گئی تھیں، چنانچہ سبیل کی عمارت دومنزلہ بنائی جاتی تھی، نیچے کی منزل تہہ خانہ کی شکل میں ہوتی جہاں پانی جمع کیا جاتا تھا، اوپر کی منزل میں چبوترے بنے ہوتے تھے، جہاں پانی پینے کا انتظام ہوتا تھا۔[۲۸]

ج۔ تعلیم وتحقیق کے لیے وقف

مسلم دنیا میں رائج اوقاف میں ایک اہم اور بڑی قسم تعلیمی اداروں کے قیام اور وہاں تعلیم وتحقیق کے لیے وقف کی تھی۔ تعلیم کے فروغ وارتقاء کے لیے بے شمار اوقاف قائم کئے گئے تھے، اوران کے ذریعہ علمی دانش گاہیں، جامعات، مدارس اور تعلیمی حلقے قائم کئے گئے تھے اوران کے انتظام وانصرام نیز تعلیم وتحقیق سے وابستہ افراد کے لیے بڑے بڑے اوقاف خاص کئے گئے تھے۔ اسی طرح بڑی بڑی لائبریریاں اور مکتبے اوقاف کی آمدنی سے قائم کئے گئے تھے اوران میں بے شمار کتابیں وقف کی گئی تھیں؛ تاکہ علم وتحقیق کا سفر تیز گامی سے جاری رہے۔ اہل علم خود بھی اپنی نادر ونایاب اور قیمتی کتابیں عام استفادہ کے لیے وقف کردیا کرتے تھے۔ بغداد، دمشق، قاہرہ، کوفہ اور بصرہ جیسے بڑے شہروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے شہروں اور آبادیوں میں بھی کتابوں کے مکتبات اور لائبریریاں قائم کی گئی تھیں۔

قزوین میں وہاں کے امیر ابوطاہر بن ابوعلی جعفری نے ۴۱۵ھ میں ایک 'دارالکتب' قائم کیا اوراس پر بڑے بڑے اوقاف متعین کئے تھے۔[۲۹] جامع اموی دمشق کے اندر خلیفہ مہدی کے زمانہ میں ۱۶۰ھ میں مغربی قبہ کی تعمیر کی گئی جس میں قیمتی کتابیں وقف کے طور پر رکھی گئی تھیں۔[۳۰] موصل میں ابوالقاسم جعفر بن محمد بن حمدان موصلی (متوفی: ۳۲۳ھ) نے 'دارالعلم' کے نام سے مکتبہ قائم کیا اور وہاں تمام علوم وفنون کی کتابیں مہیا کی تھیں، اوران سے استفادہ سب کے لیے عام کردیا تھا؛ بلکہ غریب اہل علم کو وہاں علمی تحقیق کے لیے مالی مدد بھی فراہم کی جاتی تھی۔[۳۱]

بعض مکتبات ایسے بھی قائم کئے گئے تھے جن سے ملحق کچھ کمرے بنائے گئے تھے، ان میں سے بعض کمروں میں وہاں آنے والوں کے لیے کھانا فراہم کیا جاتا تھا، اور کچھ کمرے بیرونی اسکالرز کی رہائش کے لیے ہوتے تھے؛ چنانچہ علی بن یحییٰ بن المنجم (متوفی: ۲۷۵ھ) نے بغداد سے قریب کے گاؤں میں اپنے عظیم الشان محل کے ایک حصہ میں مکتبہ قائم کیا تھا جس کا نام 'خزانۃ الحکمۃ' رکھا تھا۔ یہاں

استفادہ کے لیے دور دراز مقامات سے اہل علم آتے تھے اور ان کے اخراجات کے لیے ابن المنجم نے اوقاف متعین کرر کھے تھے۔ [۳۲]

جامعات اور مدارس کے قیام کی روایت چوتھی صدی ہجری سے عام ہوگئی تھی۔ بعض مدارس بہت بڑے اور عظیم الشان تھے اور ان میں تعلیم حاصل کرنے کے دروازے مسلم اور غیر مسلم سبھوں کے لیے کھلے رکھے گئے تھے۔ ان میں ایسے مدارس بھی تھے جو مخصوص فن کی تعلیم کے لیے متعین ہوتے تھے؛ چنانچہ ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ وزیر ابونصر سابور بن اردشیر (متوفی: ۴۱۶ھ) نے، جو ابونصر بن عضد الدولہ کا وزیر تھا، ۳۸۳ ہجری میں بغداد کے محلّہ کرخ میں ایک عمارت خرید کر اسے مکتبہ بنایا جس کا نام دار العلم رکھا، اور وہاں فقہاء کے لیے کتابیں خرید کر وقف کردیں؛ گویا یہ مدرسہ فقہاء کے لیے وقف تھا۔ [۳۳] دمشق میں ۳۹۱ھ میں شجاع الدولہ صادر بن عبداللہ نے مدرسہ صادریہ قائم کیا تھا۔ [۳۴]

مدرسہ نظامیہ دنیا کی معروف اور عظیم تعلیم گاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ وزیر نظام الملک طوسی (متوفی: ۴۸۵ھ) نے اس نام سے کئی مدارس اسلامی مملکت کے بڑے شہروں میں قائم کئے تھے، جہاں اعلیٰ معیاری تعلیم دی جاتی تھی اور رہائش و تعلیم سب مفت فراہم کئے جاتے تھے، اور ساتھ ہی طلبہ کو ماہانہ وظائف بھی دیا جاتا تھا۔ نظام الملک طوسی نے عراق اور خراسان کے مختلف شہروں میں ایسے دسیوں مدارس قائم کئے تھے، بلکہ جہاں بھی کوئی بڑا عالم ہوتا، وہاں وہ مدرسہ قائم کر کے اس عالم کی نگرانی میں دے دیتا تھا؛ تاکہ وہاں طلبہ تعلیم حاصل کریں، اور اس مدرسہ کے لیے وقف قائم کر دیتا، جس کی آمدنی سے مدرسہ کے اخراجات کی تکمیل کے علاوہ غریب طلبہ کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ نظام الملک طوسی کے قائم کردہ مشہور بڑے مدارس میں ایک بغداد کا مدسہ نظامیہ ہے جس کی تعمیر ۴۵۷ ہجری میں شروع ہوئی اور تکمیل ۴۵۹ ہجری میں ہوئی۔ اسی مدرسہ میں حجۃ الاسلام امام ابوحامد الغزالی (متوفی ۵۰۵ھ) نے تدریس انجام دی تھی۔ دوسرا مدرسہ نظامیہ نیساپور تھا جس میں امام الحرمین ابوالمعالی جوینی (متوفی: ۴۷۸ھ) نے درس دیا تھا۔ [۳۵]

وقف سے قائم ہونے والا ایک بڑا مدرسہ مستنصریہ تھا۔ یہ عظیم یونیورسٹی تھی جس کی تعمیر ۶۳۱ھ میں بغداد میں ہوئی تھی اور جس میں علوم شرعیہ اور علوم آلیہ کے علاوہ فلسفہ و ریاضیات اور فارمیسی اور میڈیکل کی تعلیم ہوتی تھی۔ مؤرخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ''اس جیسا مدرسہ اس سے قبل نہیں بنایا

گیا''۔[۳۶] خلیفہ مستنصر باللہ (متوفی: ۶۴۰ھ) نے اس مدرسہ میں بڑے بڑے اساتذہ مقرر کئے، ان کے لیے اعلیٰ سہولتیں فراہم کیں، طلبہ کے لیے عمدہ غذاؤں کا انتظام کیا اور نایاب وقیمتی کتابوں کے عمدہ سے عمدہ نسخے یہاں مہیا کرائے تھے۔

نور الدین زنگی (متوفی: ۵۶۹ھ) نے دمشق میں مدرسہ نوریہ قائم کیا تھا، جو ایک عظیم یونیورسٹی تھی۔ اسی طرح اس نے یتیم بچوں کی تعلیم کے لیے خاص اہتمام کے ساتھ وقف قائم کئے تھے۔ ایسے تعلیمی ادارے صرف دمشق ہی میں نہیں؛ بلکہ مملکت کے مختلف شہروں سنجار، حران، رہا، رقہ، شیزر، حماۃ، حمص، بعلبک اور تدمر وغیرہ میں قائم کئے گئے تھے۔[۳۷] سیاح ابن جبیر (متوفی: ۶۱۴ھ) نے اسی طرح کے ایک دارالاقامہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''یہ اپنے حسن انتظام کی وجہ سے مملکت کے لیے سرمایہ افتخار ہے''۔[۳۸] نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی نے دمشق کے مدرسہ کی فیاضانہ سرپرستی کی تھی۔ ابن جبیر نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ''نور الدین کا مدرسہ اپنی عظمت اور شوکت میں دنیا میں بے مثال ہے اور ایک شاندار محل کی طرح قائم ہے''[۳۹] اس مدرسہ کے وسیع احاطہ میں ایک بہت بڑا لکچر ہال تھا، اساتذہ اور خدام مدرسہ کے لیے رہائش گاہیں تھیں، اور رئیس المدرسین کے لیے فیملی کوارٹر بنا تھا، احاطہ کے اندر ہی مسجد تھی۔ اس 'مدرسہ نوریہ' کے لیے حکمرانوں کے علاوہ متعدد امراء نے بھی بہت سارے وقف کئے تھے۔[۴۰] صلاح الدین ایوبی نے قاہرہ میں امام حسین کے مشہد کے پہلو میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور اس پر قیمتی اوقاف قائم مقرر کئے تھے۔ دمشق میں الملک العادل (متوفی: ۶۱۵ھ) نے 'مدرسہ عادلیہ' بنایا تھا۔[۴۱] اسی طرح الملک الصالح نجم الدین ایوب (متوفی: ۶۴۷ھ) نے قاہرہ میں مدرسہ صالحیہ بنوا کر اس پر بے شمار اوقاف کئے تھے۔

اندلس میں حکم بن عبد الرحمٰن الناصر (متوفی: ۳۶۶ھ) نے بچوں کی تعلیم کے لیے متعدد مدرسے قائم کئے اور وہاں تعلیم کے انتظامات کے لیے اوقاف خاص کئے۔ صرف قرطبہ میں ۲۷ ایسے عمدہ ومعیاری مدرسے تھے جہاں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی، اور معلمین واساتذہ کے لیے فراواں انتظام ہوتا تھا۔[۴۲] یعقوب منصور (بن یوسف بن عبد المؤمن متوفی: ۵۹۵ھ) نے مغرب اقصیٰ میں ۵۹۳ ہجری میں مدرسہ جوفیہ قائم کیا تھا۔[۴۳] سلطان بنی مرین یعقوب بن عبد الحق (متوفی: ۶۸۵ھ) نے جب صلیبی جنگ میں فتح پانے کے بعد روم کے حکمراں سے صلح کی تو صلح نامہ کی ایک شرط یہ رکھی کہ صلیبیوں نے مسلم

شہروں سے جن کتابوں کو لوٹ لیا ہے انھیں وہ واپس کریں گے؛ چنانچہ جب علوم تفسیر وحدیث اور لغت واصول کی کتابوں سے لدی تیرہ سواریاں آئیں تو سلطان نے انھیں فاس منتقل کر کے وہاں اپنے قائم کردہ مدرسہ کو وقف کیا؛ تاکہ طلبہ ان سے مستفید ہوں۔[۴۴] سلطان بنی مرین نے مدارس کے قیام اور ان کے لیے کتابوں کی فراہمی پر خصوصی توجہ دی تھی۔[۴۵] قیروان میں جامع عقبہ بن نافع فہری کی حیثیت ایک مسجد کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ معیار کی تعلیمی دانش گاہ کی بھی تھی، اور بڑے بڑے علماء جیسے ابوالقاسم عبد الخالق بن عبدالوارث السیوری (متوفی:۴۶۲) اور امام قاسم بن عیسیٰ بن ناجی (متوفی:۸۳۹) نے اپنی تصنیفات اور کتابیں اس جامع کی لائبریری کے لیے وقف کی تھیں۔ سیاح عبدری مغربی نے جب ۶۸۸ ہجری میں قیروان شہر کی اس جامع عقبہ بن نافع کی لائبریری کو دیکھا تو وہاں کی نادرونایاب کتابوں کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا، وہاں قرآن کریم کے قدیم نسخے، سونے کے پانی سے تحریر کردہ کتابیں، اور دوسری صدی ہجری کی قدیم کتابیں موجود تھیں۔[۴۶]

عہد ممالیک میں مدارس کے قیام کی باضابطہ مہم جاری ہوگئی تھی، قاہرہ اور دوسرے شہروں میں محلّہ محلّہ ایسے مدارس قائم کیے گئے تھے۔ ان کے علاوہ مساجد سے ملحق مدارس الگ قائم کیے گئے تھے۔ منصور قلاوٗن (متوفی:۶۸۹ھ) نے بیمارستان منصوری کے پاس ایک ادارہ قائم کیا تھا، جہاں دو ماہر قانون اساتذہ ساٹھ بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے، ان اساتذہ اور طلبہ کی بہترین کفالت اور تنخواہ وقف سے فراہم کی جاتی تھی اور طلبہ کو گرمی وسردی کی رعایت سے لباس وپوشاک دیئے جاتے تھے۔ سلطان ظاہر بیبرس (متوفی ۶۷۶ھ) نے قاہرہ میں مدرسہ ظاہریہ بنوایا تھا، یہ مدرسہ بڑا عظیم اور عالیشان تھا جس میں عقلی اور نقلی علوم کے علاحدہ علاحدہ تخصصات اور شعبے قائم تھے۔ ایک وسیع لائبریری تھی جس میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، مدرسہ میں ابتدائی تعلیم کے لیے بھی مکتب قائم تھا۔ اس مدرسہ میں طلبہ کو مفت کھانے اور رہائش کے ساتھ تعلیم دی جاتی تھی، موسم کے مطابق کپڑے اور وظائف دیئے جاتے تھے۔ اساتذہ کے لیے طعام اور معیاری تنخواہ کا انتظام تھا۔ اس مدرسہ میں وقت کے نامور اہل کمال اساتذہ نے تدریسی فرائض انجام دیئے تھے۔[۴۷] اسی طرح سلطان حسام الدین لاجن (متوفی:۶۹۸ھ) کے زمانہ میں وقف کے مدارس پر بہت توجہ دی گئی۔ اس نے جامع طولون سے ملحق مدرسہ پر بیس ہزار دینار کی خطیر رقم وقف کی تھی۔[۴۸] حکمرانوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے امراء اور عمال

حکومت نے بھی تعلیمی اغراض کے لیے بڑے بڑے وقف قائم کئے تھے۔خواتین بھی اس کار خیر میں پیچھے نہ تھیں؛ چنانچہ سلطان محمد بن قلاؤن کی بیٹی سیدہ خوند تتر حجازیہ نے ۷۶۱ھ میں مدرسہ حجازیہ بنوایا اور اس میں لائبریری بھی قائم کی۔ مقریزی نے اس مدرسہ کی پوری تفصیل لکھی ہے اور اس کے معیار کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔[۴۹]

میڈیکل سائنس کی تعلیم کے لیے بیمارستان نوری دمشق کے ڈائرکٹر حکیم مہذب الدین (متوفی: ۶۲۸ھ) نے مدرسہ مہذبیہ قائم کیا تھا۔[۵۰] دمشق کے مشہور طبیب حکیم عماد الدین محمد بن عباس الدنیری (متوفی: ۶۸۶ھ) نے مدرسہ دنیریہ قائم کیا تھا۔ دمشق میں ہی طبیب نجم الدین یحیٰ بن محمد بن لبودی نے ۶۶۴ہجری میں مدرسہ لبودیہ بنوایا تھا۔ یہ مدارس صرف طب کی تعلیم کے لیے مخصوص تھے، جہاں سے تعلیم کی تکمیل کے بعد سرٹیفکٹ ملنے پر ہی وہ علاج معالجہ اور پریکٹس کرنے کے اہل تسلیم کئے جاتے تھے۔ یہ تمام مدارس وقف تھے، اور یہاں کے اساتذہ اور طلبہ کی تمام تر ضروریات کی مفت تکمیل کی جاتی تھی اور انھیں تنخواہ اور وظائف دیے جاتے تھے۔

امیر جمال الدین محمود بن علی نے ۷۹۷ہجری میں قاہرہ میں مدرسہ محمودیہ میں ایک بڑا مکتبہ وقف کیا تھا۔ مقریزی اس مکتبہ کی کتابوں کی کثرت اور استفادہ کے نظام سے بڑا متاثر تھا، اس کے مطابق یہاں ہر فن کی کتابیں مل جاتی تھیں۔[۵۱]

عثمانی خلافت کے زمانہ میں بھی تقریباً ہر شہر میں مدارس اور مکتبات وقف کے طور پر قائم کئے گئے تھے، جہاں غریب اور مالدار دونوں قسم کے طلبہ کے لیے مفت تعلیم کی سہولت مہیا تھی؛ چنانچہ مغنیسا میں سلطان مراد کا مدرسہ، قسطنطنیہ میں سلطان سلیم اول کا مدرسہ اور سلطان احمد کا مدرسہ مشہور مدارس شمار ہوتے ہیں۔ اس دور میں حربی مدرسہ یعنی آرمی اسکول بھی وقف کے طور پر کھولے گئے تھے۔ سلطان مصطفیٰ سوم (متوفی: ۱۱۸۷ھ) نے حربی مدرسہ قائم کیا تھا۔[۵۲]

دہلی سلطنت کے زمانے میں بھی مدارس کے قیام کی روایت جاری تھی، چنانچہ شہاب الدین عمری نے مسالک الابصار میں ذکر کیا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کے زمانہ میں صرف دہلی کے اندر ایک ہزار مدرسے تعلیم کے لیے قائم تھے، اور یہاں تدریس کے لیے حکومت کی جانب سے اساتذہ مقرر تھے۔[۵۳] فیروز شاہ نے دہلی میں ایک خوبصورت باغ کے اندر بہت بڑا اور معیاری مدرسہ بنوایا تھا، جہاں

سینکڑوں طلبہ اور اساتذہ کے قیام و تعلیم کا سرکاری انتظام کیا گیا تھا۔[۵۴]

د۔ رفاہی کاموں کے لیے وقف

اسلامی تاریخ میں وقف کی ایک عام نوعیت رفاہی کاموں کے لیے وقف کی رہی ہے۔ سماج کی مختلف ضروریات کے لیے اہل خیر اور اصحاب حکومت نے طرح طرح کے اوقاف قائم کئے تھے۔ ان اوقاف میں ایک قسم راستہ میں قیام گاہوں، مہمان خانوں، رباط اور ہوٹل کی تعمیر ہے۔ اسلام کی تاریخ میں بہت پہلے سے مسافروں کے قیام وطعام کے لیے ہوٹل کا تصور قائم ہو گیا تھا؛ تاکہ راستہ کے مسافر بلا روک ٹوک وہاں ٹھہر سکیں۔ ان رباطوں، خانات اور ہوٹلوں میں ان کے لیے مفت ٹھہرنے، کھانے پینے اور آرام کرنے کا انتظام ہوا کرتا تھا، یہاں ملازمین اور باورچی رہتے تھے جو ان مسافروں کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ یہ سارا انتظام وقف کی آمدنی سے ہوتا تھا اور خود یہ ہوٹل اور اس کی اشیاء وقف ہوا کرتی تھیں۔ ایسے ہوٹل پورے تجارتی راستوں پر جگہ جگہ بنائے جاتے تھے اور وہاں ہر طرح کی سہولیات مہیا کی جاتی تھیں۔ ان خانات اور ہوٹل یا مہمان خانوں میں عام مسافروں کے علاوہ بڑے بڑے اہل علم بلکہ بعض مواقع پر حکمراں اور خلیفہ بھی ٹھہرا کرتے تھے۔ اس سے ان مہمان خانوں کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ دمشق کے ایک مہمان خانہ میں ابوعمرو الصغیر آکر ٹھہرے، انھیں شیخ احمد بن عمیر سے علمی استفادہ کرنا تھا، اسی اثنا میں مہمان خانہ کے منتظم نے آکر خبر دی کہ شیخ خود یہاں تشریف لے آئے ہیں۔ پھر ان دونوں اہل علم میں اسی جگہ علمی مذاکرہ ہوا۔[۵۵] ابن کثیر نے لکھا ہے کہ شام کے شہروں اور سرحدی علاقوں کے احوال کا جائزہ لینے کے سفر کے دوران اسکندرونہ (موجودہ ترکی میں) شہر کے قریب ایک ہوٹل میں عباسی خلیفہ معتضد ٹھہرا تھا۔[۵۶] نورالدین محمود زنگی نے بھی راستوں میں ایسے ہوٹل اور مہمان خانے بنوائے تھے، جہاں لوگ اپنے سامانوں کی حفاظت اور شب بسری کے لیے قیام کرتے تھے۔ اس نوع کے اوقاف کے قیام میں خواتین کی حصہ داری بھی اسلامی تاریخ میں رہی ہے؛ چنانچہ عصمت الدین بنت معین الدین انر (متوفیہ: ۵۸۱ھ) نے دمشق میں ایک مہمان خانہ بنوا کر وقف کیا تھا۔[۵۷] اسی طرح ابن عساکر نے لکھا ہے کہ دمشق میں ایک خاتون نے 'ابن العنازۃ' ہوٹل بنوایا تھا۔[۵۸]

ہ۔غریبوں اورمحتاجوں کی اعانت کے لیے وقف

مذہبی اغراض، تعلیمی مقاصد اور رفاہی کاموں کے علاوہ سماج کے ضرورت مندوں، غریبوں، محتاجوں اور محروم طبقات کے لیے نوع بہ نوع کے اوقاف قائم کرنے کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ یہ اوقاف مخصوص طور پر ایسے مقاصد اور کاموں کے لیے کئے جاتے تھے کہ ان مثالوں کو پڑھ کر ان واقفین کی ذہانت اور فراخدلی پر حیرت ہوتی ہے، اور بعض اوقاف تو سماج کے غریب محتاج افراد کی ایسی ایسی ضروریات کے لیے قائم کئے گئے تھے کہ آج کے ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ سماج میں بھی ویسی مثالیں نہیں ملتی ہیں۔سماجی خدمات اور غریبوں کی اعانت کے اوقاف کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

قیدیوں کی رہائی کے لیے وقف

عہد ایوبی میں جب صلیبی جنگیں عروج پر تھیں، قیدیوں کی رہائی کے لیے متعدد اوقاف قائم کئے گئے تھے؛ تاکہ انگریزوں کی قید میں گرفتار ہونے والے قیدیوں کو رہا کرایا جا سکے۔ صلاح الدین ایوبی نے مصر کے شہر بلبیس میں اس مقصد کے لیے وقف قائم کیا تھا۔ قاضی فاضل (متوفی:۵۹۶ھ) کا قائم کردہ ایسا ہی وقف بہت اہم شمار کیا جاتا ہے، یہ وقف مصر میں قائم تھا جس کی آمدنی بہت زیادہ تھی۔۵۹ منصور قلاؤن کے ایک امیر حسام الدین طرنطای نے بھی قیدیوں کی رہائی کے مقصد کے لیے کئی اوقاف قائم کئے تھے۔[۶۰]

دودھ اور شکر آمیز پانی کا وقف

صلاح الدین ایوبی نے دمشق کے ایک قلعہ میں ایک وقف دودھ کی سبیل کا بنایا تھا، اور اس کے پاس ایک شکر آمیز پانی کی سبیل بنوائی تھی۔ مائیں یہاں سے بچوں کے لیے دودھ اور پانی لے جاتی تھیں۔ ہفتہ میں دو بار انھیں یہ سہولت مہیا کرائی گئی تھی۔[۶۱]

ختنہ کے لیے وقف

تیونس میں ایک وقف قائم تھا جس کی آمدنی سے غریب مسلمانوں کے بچوں کا ختنہ کرایا جاتا

تھا،اورضرورت کے کپڑے اور پیسے انھیں دیئے جاتے تھے۔[۶۲]

ازدواجی ناچاقی میں خواتین کے لیے وقف

مراکش میں ایک وقف اس غرض سے قائم تھا کہ جن خواتین کو اپنے شوہروں سے اَن بن ہو جائے، وہ اس وقف کے مکان میں ٹھہر جاتی تھیں، جہاں انھیں کھانا پینا مفت ملتا تھا، جب تک کہ ان کا باہمی اختلاف ختم نہ ہوجائے۔[۶۳]

برتنوں کا وقف

ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ دمشق میں اوقاف بے شمار ہیں، کچھ اوقاف غریب بچیوں کی شادی کے اخراجات کے لیے قائم تھے، کچھ اوقاف قیدیوں کی رہائش کے لیے بنائے گئے تھے، کچھ اوقاف مسافروں کے کھانے اور کپڑے کی ضرورت فراہم کرنے کے لیے خاص تھے،بعض اوقاف کی آمدنی راستوں کے بنانے اوران کی مرمت کرنے کے لیےمخصوص تھی[۶۴]ابن بطوطہ کے مطابق ایک وقف کا نام'اوقاف الدوانی' (برتنوں کا وقف) تھا، کہ جن نوکر اور غلام ومزدور سے کام کرتے ہوئے ظروف یا برتن ٹوٹ جائیں' وہ اپنے آقا اور مالک کی ڈانٹ سے بچ سکیں۔اس کے لیے وہ ان اوقاف کی دکان پر ٹوٹا برتن دے کر نیا برتن مفت حاصل کر لیتے تھے۔[۶۵]بیروت میں بھی ایسا ہی ایک وقف'وقف القاقورہ' اور'وقف الابریق' کے نام سے قائم تھا،جس کی دکان سے بچے بچیاں اورنوکر اپنے ٹوٹے برتن دے کر اسی جیسا نیا برتن مفت حاصل کرلیا کرتے تھے۔[۶۶]

سواری کا وقف

مصر میں ایک وقف کا نام'وقف البغلہ' (خچر کا وقف) تھا۔یہ وقف سواری تھی جو جامعہ ازہر کے اساتذہ کو مفت میں فراہم کی گئی تھی،اور وقف کی آمدنی سے ان جانوروں پرخرچ کیا جاتا تھا۔[۶۷]

زیورات کا وقف

عثمانی خلافت میں ایک وقف شادی اور تقریبات کے لیے خواتین کے زیورات اور بناؤ

سنگھار کے سامان بطور عاریت دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔خواتین یہاں سے زیورات لے جاتیں اور تقریب کے بعد واپس کر دیا کرتی تھیں؛ تا کہ غربت کی وجہ سے تقریبات میں ان کی دل شکنی نہ ہو۔[۶۸]

دہلی سلطنت کے زمانہ میں خواتین کی شادیوں کے لیے مملکت کی جانب سے فراوانی سے اعانت کی جاتی تھی۔سراج عفیف نے لکھا ہے کہ ”سادات وقضاۃ ودیگر اعیان ملک فیروزشاہ کی جودوسخا سے خردسالی میں اپنی لڑکیوں کو بیاہتے تھے،اور لڑکیوں کو ان کے شوہروں کے حوالے کر دیتے تھے۔[۶۹]

خلاصہ بحث

ان مثالوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں اوقاف کی عمدہ اور شاندار مثالیں ملتی ہیں، یہ اوقاف سماج کی متنوع اور مختلف ضروریات کے لیے قائم کئے گئے تھے، سماجی فلاح و بہبود، رفاہ عام، غریبوں اور محتاجوں کی امداد واعانت، ضرورت مندوں کی ضروریات کی تکمیل نیز تعلیم وتدریس، تحقیق وریسرچ اور طبی تعلیم کے اداروں کے قیام اور علاج ومعالجہ کے لیے معیاری اسپتال، اسی طرح مسافروں کے لیے مہمان خانے اور ہوٹل کے قیام کی بہتر سے بہتر سہولتوں کے لیے یہ اوقاف قائم کئے گئے تھے۔اوران کے انتظامات اور اخراجات کے لیے ان اوقاف پر دوسرے بہت سے اوقاف خاص کئے گئے تھے۔شاہان وقت اور والیان ریاست پوری فراخدلی کے ساتھ ایسے اوقاف قائم کرتے تھے، اوران کی بہتر کارکردگی کے لیے بذات خود بھی ان کی نگرانی کیا کرتے تھے۔بعد میں آنے والے حکام اورامراء ان قائم اوقاف کے تسلسل کے لیے ان پر مزید اوقاف قائم کرتے رہتے تھے۔ان اوقاف کی وجہ سے سماج میں تعلیم، رفاہ عام اور محروم طبقات کی باعزت زندگی کے لیے مہتم بالشان اور ضروری کام انجام پا رہے تھے، اور سماج میں ترقی اور خوشحالی عام ہو رہی تھی۔

نئے اوقاف کی ضرورت

سابقہ صفحات میں ہم نے دیکھا کہ پوری اسلامی تاریخ میں اور مسلم حکومتوں کے تمام علاقوں میں نوع بہ نوع اوقاف کے قیام اوران کے انتظام وانصرام کے کام جاری تھے۔خود مملکت کے سربراہان،

سلاطین اور امراء اپنی ذاتی دلچسپی اور اہتمام میں ان اوقاف کی کارکردگی پر نظر رکھتے تھے، اور سماج کی نئی نئی ضرورتوں کے پیش نظر نئے نئے اوقاف قائم کئے جاتے تھے۔

لیکن جب مسلم حکومتیں زوال سے دوچار ہوئیں، اور استعماری طاقتوں نے مسلم ملکوں پر قبضے کئے تو انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کے رفاہی نظام کو بگاڑا، بلکہ ان کے وسائل اور ریسورسز پر زبردستی قبضہ کرلیا۔ اوقاف کی اراضی اور عمارات ان کا خاص نشانہ تھیں، چنانچہ ان کو زبردست نقصان پہنچایا گیا، اور جو اوقاف باقی رہ گئے تھے انھیں بھی ناکارہ کردیا گیا۔ پھر استعماری دور میں مسلم سماج کے اندر علمی اور اخلاقی زوال اس قدر زیادہ آ گیا کہ وہ اپنے بچے کھچے اوقاف کا تحفظ اور ان کی ترقی وفروغ کی ذمہ داری انجام نہ دے سکے۔ دوسری طرف سیاسی اور معاشی زبوں حالی کی وجہ سے نئے نئے اوقاف کے قیام کا رواج کم سے کم بلکہ ناپید ہوتا چلا گیا۔

علامہ شکیب ارسلان (متوفی: ۱۹۴٦ء) نے 'حاضر العالم الاسلامی' میں لکھا ہے:

> ''مسلم چیریٹی کے اداروں کا زوال پچھلی صدیوں میں اس وجہ سے ہوا کہ مسلمانوں کا سیاسی زوال ہو گیا تھا، ورنہ اس سے قبل کے دور میں مسلم مملکت کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں شفاخانے، جذام کے بیماروں کے لیے گھر، پاگلوں کے لیے رہائش گاہیں، بوڑھوں کے لیے پناہ گاہیں، اندھوں کے لیے گھر وغیرہ نہ ہوتے ہوں۔ اور یہ سارے انتظامات نفع بخش اور بڑے بڑے اوقاف سے ہوتے تھے، جن کی آمدنی سے پوری خوشحالی کے ساتھ یہ سارے کام انجام پاتے تھے''۔[۷]

تیسری جانب زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے معیشت کے فروغ اور سرمایہ کاری کی نئی نئی شکلیں اور طریقے رائج ہوتے چلے گئے۔ بڑی بڑی صنعتوں کے قیام، بڑی کمپنیوں کے رواج، ان کے شیرز کی خرید وفروخت، اور سرمایہ کاری کی نت نئی شکلوں نے معاشی ترقی کے نئے میدان کھول دئے۔ اب صرف زمینوں کے وقف کے بجائے سرمایہ کاری کے ان نئی صورتوں کو وقف کے لیے استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔

اس منظرنامہ کے ساتھ ساتھ اگر مسلم سماج کی صورت حال اور زمانہ کی ضروریات پر نظر ڈالی

جائے تو ماضی میں قیام وقف کے مقاصد کی جتنی مثالیں ملتی تھیں، وہ سارے مقاصد بلکہ ان سے زائد اس وقت مسلم سماج کی سنگین ضرورت بنے ہوئے ہیں۔ مسلم قوم میں تعلیمی پسماندگی انتہا پر ہے، اور تعلیم مہنگی بنادی گئی ہے۔ اسی طرح امراض کی کثرت اور علاج کی گراں باری نے مسلم سماج کو کمزور کررکھا ہے، معاشی تنگی کی صورت نہ صرف تشویشناک بلکہ ایمان واخلاق کے لیے زہر قاتل بنی ہوئی ہے۔ دیگر سماجی ضروریات جیسے غریبوں کی اعانت، قیدیوں کی رہائی، مقدمات کے اخراجات، شادی بیاہ، تعلیمی فیس، چھوٹے موٹے کاروباریوں کے لیے مالی امداد اور قدرتی آفات ومصائب میں ان کی امداد جیسے کاموں کے لیے منفعت بخش اوقاف کے قیام کی سخت ترین ضرورت ہے۔

ایسی صورت حال میں اس بات کی ضرورت ہے کہ سرمایہ کاری کی نئی شکلوں سے استفادہ کرتے ہوئے مقاصد شریعت کی روشنی میں نئے اوقاف قائم کئے جائیں، اور پراپرٹی اور زمینوں کے علاوہ آمدنی اور سرمایہ کاری کی دیگر رائج صورتوں سے بھر پور استفادہ کیا جائے۔

حواشی

۱۔ ابن ہشام، سیرت ابن ہشام، [جلد دوم] ص:137، دار الکتاب العربی (بیروت) 1990

۲۔ حوالہ سابق، ص:159

۳۔ محمد بن عیسی ترمذی، جامع ترمذی، حدیث نمبر:3707

۴۔ محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، حدیث نمبر:2737

۵۔ دیکھئے مثال کے طور پر قرآن میں سورہ بقرہ کی آیات نمبر: 254، 262، 267، سورہ حدید کی آیات نمبر: 7، 10، 215، 219، 261، 274، سورہ حج کی آیت نمبر 35 اور سورہ قصص کی آیت نمبر 54

۶۔ سورہ حدید، آیت نمبر:7

۷۔ محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، حدیث نمبر:1902

۸۔ مسلم بن حجاج قشیری، صحیح مسلم، حدیث نمبر:1631

۹۔ خصاف، ابوبکر احمد بن عمرو، احکام الاوقاف، ص:6، مطبعة دیوان عموم الاوقاف (مصر)

۱۰۔ دیکھئے لفظ 'وقف'، وزارت اوقاف کویت، موسوعہ فقہیہ، لفظ 'وقف'

۱۱۔ ابن الاثیر الجزری، الکامل فی التاریخ [جلد چہارم] ص:292، دار الکتب العلمیہ (بیروت) 1987

۱۲۔ ابن العبری،ابو الفرج ، تاریخ مختصر الدول،ص:110-109،دار الکتب العلمیه(بیروت)1997
۱۳۔ ابن ابی اصیبعہ ،عیون الانباء فی طبقات الاطباء[جلددوم]ص:80، مکتبه دار الحیاة (بیروت)
۱۴۔ایضاً،[جلداول]ص:230
۱۵۔ احمد بن علی مقریزی،المواعظ و الاعتباربذکر الخطط و الآثار [جلد چہارم]ص:267،دار الکتب العلمیه(بیروت)1998
۱۶۔ ابن ابی اصیبعہ ،عیون الانباء فی طبقات الاطباء،ص:301، مکتبة دار الحیاة(بیروت)
۱۷۔ مقدسی،ابوشامہ، کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین النوریة و الصلاحیه[جلداول]ص:105،دار الکتب العلمیه(بیروت)2002
۱۸۔ محمد بن احمد ابن جبیر، رحلة ابن جبیر،ص:26-25، مکتبة الهلال (بیروت)
۱۹۔ عبدالواحد المراکشی، المعجب فی تلخیص اخبار المغرب،ص:238-237،دار الفرجانی (قاہرہ) 1994
۲۰۔ ابن تغری بردی،جمال الدین یوسف ،النجوم الزاهرة فی ملوک مصر و القاهرة[جلد ہفتم]ص: 327،دار الکتب المصریه(قاہرہ)1929
۲۱۔ الذہبی،شمس الدین، تاریخ الاسلام ووفیات المشاهیر و الاعلام،[جلد51]ص:312، دار الکتاب العربی(بیروت)2000
۲۲۔ ابن کثیر،اسماعیل بن عمر،البدایه و النهایه[جلد17]ص:345،دار هجر للطباعه و النشر(قاہرہ)1998
۲۳۔ السباعی،مصطفیٰ حسنی،من روائع حضارتنا،ص:231،دار الوراق (بیروت)1999
۲۴۔ ابن عساکر،علی بن حسن،تاریخ مدینة دمشق[جلددوم]ص:370،دار الفکر(بیروت)1995
۲۵۔ ایضاً[جلددوم]ص: 386-378
۲۶۔ المسعودی،علی بن حسین بن علی،مروج الذهب و معادن الجوهر [جلد چہارم]ص:252، مکتبه عصریه ،(بیروت)2005
۲۷۔ الذہبی،شمس الدین،ایضاً[جلد46]ص:255
۲۸۔ راغب السرجانی، روائع الاوقاف من الحضارة الاسلامیه،ص:141،شرکة نهضة (مصر)2010
۲۹۔ الرافعی،عبدالکریم بن محمد بن عبدالکریم القزوینی، التدوین فی اخبار قزوین [جلداول]ص:199، دار الکتب العلمیه (بیروت)1987
۳۰۔ ابن کثیر،ایضاً[جلد12]ص:600

۳۱۔ یاقوت حموی، معجم الادباء،ص:794،دار الغرب الاسلامی (بیروت)1993
۳۲۔ ایضاً،ص:2014
۳۳۔ ابن کثیر،ایضاً[جلد15]ص:447۔
۳۴۔ ابن عساکر،ایضاً[جلد25]ص:45-46
۳۵۔السباعی،ایضاً،ص:213اور آگے
۳۶۔ ابن کثیر،ایضاً[جلد17]ص:212-213
۳۷۔ ابن عساکر،ایضاً[جلد57]ص:121
۳۸۔ ابن جبیر،ایضاً،ص:220
۳۹۔ ایضاً،ص:231
۴۰۔ ایضاً
۴۱۔ ابن کثیر،ایضاً[جلد13]ص:82
۴۲۔ العذاری،احمد بن محمد، البیان المغرب فی اختصار اخبار ملوک الاندلس و المغرب ،جلد:2،ص: 226، دار الغرب الاسلامی(تیونس)2013
۴۳۔ الناصری،احمد بن خالد،کتاب الاستقصاء لأخبار دول المغرب الاقصیٰ [جلددوم]ص:195، دار الکتاب الدار البیضاء1997
۴۴۔ ایضاً[جلدسوم]ص:64
۴۵۔ایضاً[جلدسوم]ص:111
۴۶۔ محمد العبدری البلنسی ،الرحلہ المغربیہ،ص:103، مؤسسة بونہ للبحوث والدراسات (الجزائر) 2007
۴۷۔ ابن تغری بردی، جمال الدین ابوالمحاسن،النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرہ [جلدہفتم] ص:107، دار الکتب المصریہ(قاہرہ)1929
۴۸۔ المقریزی،تقی الدین احمد بن علی، السلوک لمعرفة دول الملوک[جلددوم]ص:297(مصر)
۴۹۔ المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار [جلدسوم]ص:487، دار الکتب العلمیہ(بیروت)1998
۵۰۔ ایضاً[جلدسوم]ص:543
۵۱۔ ایضاً[جلدسوم]ص:520

۵۲۔ محمد فرید، تاریخ الدولة العثمانیه،ص:446، دار النفائس (بیروت)1981
۵۳۔ العمری،شھاب الدین احمد بن یحیی، مسالک الابصار فی ممالک الامصار [جلد سوم]ص: 49،دار الکتب العلمیه(بیروت)2010
۵۴۔ برنی،ضیاءالدین،تاریخ فیروز شاہ،ص:565،سر سید اکیڈمی (علی گڑھ)2005
۵۵۔ ابن عساکر،ایضاً[جلد پنجم]ص:15
۵۶۔ ابن کثیر،ایضاً[جلد پنجم]ص:635
۵۷۔ ابن العماد حنبلی،شذرات الذھب فی اخبار من ذھب [جلد ششم]ص:446، دار ابن کثیر (بیروت) 1986
۵۸۔ ابن عساکر،ایضاً[جلد دوم]ص:320
۵۹۔ ابن العماد حنبلی،ایضاً[جلد ششم]ص:533
۶۰۔ ابن تغری بردی،ایضاً،[جلد ہفتم]ص:384
۶۱۔ مصطفیٰ حسنی سباعی،ایضاً،ص:99-98
۶۲۔ شوقی ابوخلیل، الحضارة العربیه الاسلامیه،ص:337-336،دار الفکر (دمشق)1996
۶۳۔ ایضاً
۶۴۔ ابن بطوطہ،محمد بن عبد اللہ طنجی ، تحفة النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار،رحله ابن بطوطه،ص:119،دار احیاء العلوم(بیروت)1987
۶۵۔ ایضاً،ص:120
۶۶۔ سباعی،مصطفیٰ حسنی،ایضا،ص:102
۶۷۔ سباعی،مصطفیٰ حسنی،ایضا،ص:102
۶۸۔ امیر شکیب ارسلان،حاضر العالم الاسلامی[جلد سوم]ص:8، مطبعه عیسی البابی الحلبی (قاہرہ) 1352
۶۹۔ سراج عفیف،تاریخ فیروز شاہی،ترجمہ فدا علی،ص:139،دار الطبع جامعه عثمانیه(حیدرآباد)1938
۷۰۔ امیر شکیب ارسلان،ایضاً،[جلد سوم]ص:7

خواجہ غلام السدین *
ترجمہ: نثار احمد فاروقی**

اسلام امن و آشتی کا مذہب

(۲)

آفاقی انسان کا تصور

میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اُس نے آفاقی انسان کے تصور کو اُجاگر کرنے میں مدد دی ہے۔ انسانی تاریخ میں دو رجحان کارفرما رہے ہیں اور ان دونوں میں ہمیشہ سے رسّا کشی بھی ہوتی رہی ہے۔ انسان جب تاریخ کے منظر پر آیا تو وہ اپنی زمین، جغرافیہ اور موسم کے بندھن میں جکڑا ہوا تھا اور بے شمار صدیوں تک ان حالات میں اسیر رہنے کے بعد اب ان بندشوں کو کچھ کچھ ڈھیلا کرسکا ہے۔ موسم کے سرد و گرم ہونے کا اختلاف، زمین کی زرخیزی میں کمی بیشی، آزاد پھرنے والے چوپایوں کا پھیلاؤ جو اکثر انسان سے زیادہ طاقت ور تھے، اِن میں سے کوئی بات بھی زندگی کے اُس توازن کو کسی وقت بھی درہم برہم کرسکتی تھی جو انسان نے بڑی مشقت کے بعد حاصل کیا تھا۔

لاکھوں برس میں انسان نے بستیاں بسا کر قبائل کی صورت میں رہنا سیکھا، جہاں وہ اپنے

* ماہرِ تعلیم و سابق سکریٹری، وزارت تعلیم ہند

** سابق پروفیسر و صدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی (دہلی)

اور مویشیوں کے لیے غذا حاصل کر سکے اور اُس کا ذخیرہ بھی رکھ سکے۔ یہاں اُس نے چھوٹے چھوٹے جتھے بنائے، جو ہمیشہ ایک دوسرے پر غُرّاتے رہتے تھے کیوں کہ مشکل سے حاصل ہونے والی غذا کے وسیلوں پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے جھگڑا ہونا بھی ناگزیر تھا۔ اُس عہد کے انسان کی وفاداریاں صرف اپنے قبیلے کے ساتھ ہوتی تھیں اور وہ قبائلی رسوم ورواج میں بُری طرح جکڑا ہوا تھا۔ اس کا اخلاق اور کردار بھی قبیلے کے طرزِ زندگی سے تشکیل پاتا تھا۔ آسٹریلیا کے ایک قدیم چشتی قبیلے میں یہ رسم ہے کہ جب قبیلے کا سردار جنگل میں ٹہلنے کو نکلے تو قبیلے کے ہر فرد کو چاہیے کہ وہ زمین پر دراز ہو جائے۔ ان کے آبا واجداد جو کچھ کرتے رہے ہوں اُسے اِن کی نگاہ میں ایک طرح کا تقدس حاصل ہو جاتا تھا، پھر وہ طویل زمانے تک ان کے خیالات اور روایات کی تقلید کرتے رہتے تھے اور ایسا کرنے کے لیے یقیناً تھوڑا سا جواز بھی موجود تھا کیوں کہ ان کی دنیا چاروں طرف سے بھانت بھانت کے معلوم اور مجہول خطروں میں گھری ہوئی تھی اور انھیں گزرے ہوئے لوگوں کی حکمتوں سے ہی جینے کا حوصلہ ملتا تھا لیکن جب ذہن اِس رویے میں پختہ ہو جاتا ہے تو یقیناً ترقی کی راہ مسدود ہونے لگتی ہے۔ ایسا ذہن رجعت پسند ہوتا ہے، حالتِ موجودہ میں کوئی انقلاب نہیں چاہتا اور رسوم وروایت کی بالادستی پر اصرار کرتا ہے۔ جدّت خواہ اعمال میں ہو یا افکار میں، اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ یہ ذہنیت دنیا کے سبھی علاقوں اور تہذیبوں پر صدیوں تک حاوی رہی ہے اور آج تک ہے۔ حق کو تلاش کرنے اور اُسے قبول کرنے کی راہ میں اکثر یہی بھاری پتھر ثابت ہوتی ہے۔ قرآن اِس ذہنیت سے بار بار خبردار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سابقہ امتوں کی طرح عرب کے اصنام پرست بھی حضرت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کے جواب میں یہ کہتے ہیں:

> وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْاْ إِلَى مَا أَنزَلَ اللّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُواْ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لاَ يَعْلَمُونَ شَيْئاً وَلاَ يَهْتَدُونَ.
>
> ''اور جب کہا جاتا ہے اُن کو آؤ اس کی طرف جو کہ اللہ نے نازل کیا اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں ہم کو کافی ہے وہ جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو۔ بھلا اگر ان کے باپ دادے نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ راہ

جانتے ہوں تو بھی ایسا ہی کریں گے؟''[۱]

اسلام کا نہایت واضح نظریہ یہ ہے کہ طریقِ آباء کی آڑ لے کر کسی حقیقت یا برتر صداقت کو جھٹلانا غلط اور غیر منصفانہ ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ کہتا ہے:

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ عَلَیْکُمْ أَنفُسَکُمْ لاَ یَضُرُّکُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَیْتُمْ إِلَی اللّهِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعاً فَیُنَبِّئُکُم بِمَا کُنتُمْ تَعْمَلُون.

''ایمان والو! تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جب کہ تم ہوئے راہ پر۔ اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے تم سب کو پھر وہ جتلا دے گا تم سب کو جو کچھ تم کرتے تھے۔''[۲]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ساری دنیا ہٹ دھرمی اور باطل پرستی کی راہ اختیار کر لے تب بھی یہ ہمارے لیے اتباع کرنے کا جواز نہیں ہوسکتا۔ حق جہاں بھی ہو اس کے لیے ثابت قدم ہونا چاہیے کیوں کہ ہر فرد آخرت میں اپنے کردار کا خود جواب دہ ہوگا۔

کاروانِ تہذیب آگے بڑھتا رہا اور انسان آہستہ آہستہ قبائلی دور سے نکلا، اس نے اپنے آپ کو زیادہ بڑے گروہوں میں منظّم کیا۔ گاؤں، قصبے، شہر، ملک اور بادشاہت کی تشکیل کی۔ اب اس کے فکر وعمل کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا گیا اور نئے حالات نے مہذب زندگی گزارنے کے لیے تصورات کا تقاضہ کیا۔ نئی قانون سازی ہوئی۔ جھگڑوں کو طے کرنے کے نئے ذرائع ڈھونڈے گئے۔ آئے دن پیچیدہ تر ہوتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے وسیلوں کی مانگ بڑھی۔ اِس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض دیدہ ور شخصیات نے، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، برابر کوشش کی ہے کہ وہ نئے تقاضوں کی تکمیل کے لیے اپنے طرزِ فکر اور نظریات کی جدید تنظیم کریں اور بعض پہلوؤں سے انھیں خاص کامیابی بھی میسر ہوئی ہے۔ اب وہ پرانی قبائلی وفاداریاں نئے قومی نظریات میں بدل گئی ہیں اور ایک نیا اُبھرتا ہوا احساس ''عالمگیر انسانیت'' (ورلڈ کمیونٹی) کا بھی ہے جسے عہدِ حاضر کی مشینی ترقیوں نے صرف خوش آئندہ ہی نہیں بلکہ ضروری بنا دیا ہے۔

اپنی بدعنوانیوں اور رجعت پسندی کے باوجود، مذاہب نے اس تبدیلی کے لانے میں خاصا

اہم رول ادا کیا ہے۔ اتنا اہم کہ درحقیقت مذہب کی وجہ سے ہی یہ بیل منڈھے چڑھ سکتی ہے۔ لیکن یہ ایک دائمی اور مسلسل جد وجہد ہے، جو علاقہ فتح کیا جائے اُس کی حراست بھی پوری چوکسی کے ساتھ کرنا پڑتی ہے کیونکہ ایسی بہت سی طاقتیں ہیں جو ان کامیابیوں کو خاک میں ملانے کے درپے رہتی ہیں۔ بعض لوگ خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض موجودہ صدی میں رہ کر سوچتے ہیں کہ اب ظلم وتعدّی اور مطلق العنانی کا زمانہ گزر چکا ہے، مگر پھر بھی کوئی ہٹلر، کوئی مسولینی کوئی اسٹالن، خاص مغربی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور بدترین قسم کی بربریت کو کھلی چھوٹ دے دیتا ہے۔ یا مثلاً آج سے صدیوں پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محبت اور رحم دلی کے پیغام کی تبلیغ کی تھی اور جب یہ دنیا کے بڑے حصے میں شائع ہو گیا تو اسی مذہب کے عظیم رہنماؤں کے ظلِّ حمایت میں عدالت احتساب (Inouisition) نے اسے کوڑوں، شکنجوں اور آگ کی بھٹیوں کے روپ میں بدل دیا۔ یہ پکڑ دھکڑ جو اکثر ایک ہی مذہب کے پیروؤں کے درمیان خوں ریز جنگ کی شکل اختیار کر لیتی تھی، اُس خدا کے نام کی سب سے بڑی بے حرمتی تھی جسے تقریباً تمام مذاہب میں رحمٰن ورحیم کہا گیا ہے۔

مذاہب کا مقصد اگرچہ ان تفرقوں کی دیواروں کو ڈھانا تھا جنھوں نے انسان کے قلب ودماغ کو جکڑ لیا ہے اور وہ انسانی اخوت کا پرچار کرتے تھے مگر انھیں بھی بردارکشی اور خوں ریزی کے لیے آلۂ کار بنایا گیا اور عوام کو ان لڑائیوں میں جھونکنے کے لیے جنت کے وعدے اور دوزخ کی وعیدیں استعمال کی گئیں۔ گویا خدا بھی حسن بن صباح کی طرح تھا جو حشیشیوں کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے سرسبز باغ دکھاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ماضی کے کسی بھی دور کے مقابلے میں آج ہمارے عہد کی جنگ زیادہ وحشیانہ اور ہمہ گیر ہو چکی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے بہت ترقی کر لی ہے اور انھیں جنگ وجدال کے نئے طریقوں میں بہت زیادہ مؤثر وسفاکانہ طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اب یہ بہت زیادہ ''غیر شخصی'' اور خوفناک بھی ہوتی جاتی ہے اور ایسی ناقابلِ تصور تباہ کاریاں آناً فاناً پیدا کر سکتی ہے کہ حملہ کرنے والے کو اپنے ہدف مظالم سے ذاتی طور پر واقف ہونے کا موقع بھی نہیں ملتا جو وہ یہ جان سکے کہ اس نے لاکھوں بے گناہ مرد وزَن اور معصوم بچوں پر کیا ظلم ڈھایا ہے۔ اس کا تو یقیناً بہتوں کو پتا نہیں چل سکتا کہ آنے والی نسلوں پر ان وحشیانہ اَقدامات کے کیا دوررس اثرات مرتب ہوں گے، اس کے باوجود ایسے احمق، ناقبت اندیش،

بے حس اور سخت دل انسانی بھی ہیں جو بڑی طاقتِ لسانی کے ساتھ ایٹم بم بنانے کی حمایت کرتے ہیں تا کہ وہ بھی فلاں اور فلاں ملک کی ہمسری کر سکیں۔ اس کی بجائے یہ نہیں کرتے کہ اپنی اجتماعی قوت کو کام میں لا کر جہاں جہاں ایٹمی اسلحہ کے ذخیرے موجود ہیں انھیں ختم کرنے کی جدو جہد کریں۔ ساری قومیں موت اور تباہی کے اس چکر کو پھیلاتی جارہی ہیں اور اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ اسے کبھی استعمال نہیں کریں گی۔

اس سے کیا ثابت ہوتا ہے، میں تو اِس کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ انسان نے جو کچھ ترقیاں کی ہیں وہ اس کے رگ و ریشے میں پیوست بہیمیت کو ختم نہیں کر سکی ہیں۔ جب بھی اس درندگی کو سازگار ماحول ملتا ہے وہ پھر زندہ ہو کر سر اٹھانے لگتی ہے پھر بھی یہ سچ ہے کہ خیر سگالی اور رحم دلی کے جذبات کی تبلیغ کرنے والے عظیم اور صاحبِ فکر ونظر مرد و زَن، بلکہ بعض حالات میں ان صفات کی حامل پوری پوری جماعتوں نے اِس دُکھوں بھری زندگی کو ہر زمانے میں باوقعت بنائے رکھا ہے، وہ اپنے علاقے اور مذہب کی وفاداریوں سے بلند ہو گئے ہیں مگر کچھ اور بھی زنجیریں ہیں جو ان سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ مثلاً رنگ، نسل، عقیدہ، قوم اور قبیلہ جن میں وہ بندھے ہوتے ہیں اور جن کے لیے اپنی جان اور آن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ایسا ہمیشہ اُن کی خواہش اور کوشش سے ہی نہیں ہوتا کبھی کبھی وہ مفاد پرستوں یا سیاسی اور سماجی رجعت پسندوں کا آلۂ کار بھی بن جاتے ہیں جو اُن کی آڑ لے کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ''وطنیت'' میں کہا ہے کہ تہذیبِ حاضر نے نئے نئے بُت تراش لیے ہیں اور:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں یہ ریمارک کسی کو بہت سخت معلوم ہو سکتا تھا مگر اُس وقت سے اب تک حالات نے ایسی کروٹیں بدلی ہیں کہ ''قومیت'' کا یہ تصور اپنے خالص سیاسی مفہوم میں صرف مذہب ہی کے لیے خطرہ نہیں بلکہ عالمی برادری کی تشکیل اور اس مقصد کے لیے جن رویوں کو اپنانے کی ضرورت ہے اُس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن رہا ہے۔

انسانی شعور بھی اتنی شدت سے علاقوں میں محصور ہو گیا ہے کہ زیادہ رواداری اور رحم دلی پیدا

کرنے کی بجائے یہ انسانوں کو محدود علاقائی وفاداریوں کے سبب پیدا ہونے والے جھگڑوں میں الجھا سکتا ہے۔ دنیا کو تاخت وتاراج کرنے والی کتنی ہی جنگیں ہیں جن میں اس جارحیت پسند تصورِقومیت نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا ہے کیوں کہ اس کے نزدیک قتل وخون پر آمادہ رہنا حب الوطنی کا معیار ہے ایسے لوگ رحم دلی یا مقصد انسانیت کا وسیع تر تصور رکھنے کو ''وطن دشمنی'' کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔

لیکن تنگ نظری کی لعنت کا یہ آسیب صرف ہمارے ہی بین الاقوامی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہورہا ہے بلکہ ایک ہی قوم کے مختلف طبقات میں بھی جو صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے بستے آئے ہیں اور جنھوں نے طویل زمانے تک شانہ بشانہ رہ کر کام کیا ہے اور ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک رہے ہیں تعصب کا زہر گھول دیا ہے اور یہ صرف اِس لیے ہورہا ہے کہ کچھ افراد یا فرقے کسی دوسری نسل یا رنگ یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کے سیاسی نظریات کچھ مختلف واقع ہوئے ہیں۔ یہ ناروا داری جو قوموں کے روابط پر اثر انداز ہورہی ہے اس کی جھوٹ فرقوں کے باہمی تعلقات پر بھی پڑتی ہے اور اس بیہودہ ذہنیت کی مثالوں کے لیے ہمیں تاریخ میں زیادہ دور تک جانے کی ضرورت نہیں ہوگی، اِس کا مشاہدہ آج بھی دنیا کے کسی بھی ملک میں کیا جاسکتا ہے۔ اِسے قوم، مذہب، ذات پات سیاست یا دوسرے اختلافات سے شہ ملتی ہے جنھیں لوگ زیادہ شدت سے اپناتے جارہے ہیں کیوں کہ ہم نے اب تک بھی اپنے اندر وہ رواداری پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے جو مِل جُل کر زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ جب تک ہم ان بندھنوں سے چھٹکارا نہیں پائیں گے جو ہمیں فکرِ مستقیم اور انسان دوستی سے روکتے ہیں اور ہمارے نرم ونازک دلوں کو پتھر بنائے دے رہے ہیں اُس وقت تک ہمیں کسی طرح کا حقیقی ارتقاء نصیب نہیں ہوسکتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سارے علاقائی رشتے یا ہم مذہبوں اور ہمسایوں سے ہمارے گہرے تعلقات قابلِ ملامت ہیں، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ اگر رکاوٹ بننے لگیں اور انسانیت کے بڑے دھارے اور ہمارے مخصوص فرقے میں تصادم کی صورت پیدا کرنے لگیں تو ہمیں ضرور بروقت چوکنّا ہوجانا چاہیے۔ محض اختلافات قابلِ سرزنش نہیں ہوا کرتے کیوں کہ ان میں سے بعض مثلاً لسانی، تہذیبی یا فنّی اختلافات نے انسان کے ثقافتی ورثے کو مالا مال کیا ہے اور اسے گہری معنویت عطا کی ہے، البتہ نیکی، رواداری اور باہمی مفاہمت کے

جذبات میں کوتاہی کرنے سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور یہ مذہب کا کام ہونا چاہیے کہ وہ اِن خوبیوں کو پیدا کرنے کی لگا تار کوشش کرتا رہے۔ مگر بہت افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مذہب نے یہ رول صرف کبھی کبھار ادا کیا ہے اور اس کا جتنا الزام تاریخ کی دوسری قوتوں پر عائد ہوسکتا ہے، فرقہ بندی کے رجحان پر اس کی ذمہ داری اُس سے کسی طرح کم نہیں ہے اور بھی زیادہ افسوس کہ بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ مذاہب کے بنیادی مقاصد اور تیقن کے خلاف ہوا ہے۔ دنیا کے بڑے کلاسیکی مذہبوں کے وجود میں آنے سے پہلے ابتدائی مذاہب نے بھی اپنے اپنے انداز میں انسان کو ذہن ونظر کی وسعتیں عطا کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ احساس دلایا تھا کہ انسان کا اس کائنات اور سورج اور ستاروں سے کچھ رشتہ ہے جو اس کی تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان میں حیات بعدِ موت کا تصور بھی موجود تھا جسے وہ اپنے وحشیانہ انداز میں ظاہر کرتے تھے۔ اس کی جھلک ہم تدفین کے ان طریقوں میں دیکھ سکتے ہیں جو مثلاً فراعنہ مصر کے لیے اختیار کیے گئے۔ انھیں ساری روزمرہ استعمال کی چیزوں کے ساتھ دفنایا جاتا تھا جن کے بارے میں خیال تھا کہ اس دنیا میں دوبارہ آتے وقت اُن اشیاء کی ضرورت ہوگی۔ ان ابتدائی تصورات نے بھی انسان کی زندگی کو کچھ نئی معنویت اور گہرائی عطا کی تھی مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور کلاسکی مذاہب نے ذہن انسانی کی تشکیل شروع کی تو نہ صرف بنی نوعِ انسان میں، بلکہ ساری کائنات میں ایک ربط واتحاد کا تصور پیدا ہوا۔ لیوس ممفورڈ (Lewis Mumford) نے بڑی بصیرت کے ساتھ اِس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان نے عالمی برادری کا ایک فرد اور ایک آفاقی انسان بننے کا اپنا سفر کس طرح طے کیا ہے۔ ''تزکیہ' باطن کی مدد سے انسان اپنے آپ کو مقامی جتھوں کی تقدیر سے الگ کرتا ہے اور ایک وسیع تر کائناتی معاشرہ کا رکن بن جاتا ہے۔ ابتداء میں یہ صرف تصوراتی امر تھا، مگر نئے مقاصد اور نئی بصیرتوں کے ساتھ وہ دل شکن تاریخی تجربات اور زمینی فرقہ بندیوں سے بلند ہوتا گیا۔ اس عمل کو آپ ''شخص'' کی پیدائش کا نام بھی دے سکتے ہیں اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کی بدولت اس متحدہ انسانیت کا ابھرنا ہوسکا جواب تک نا قابلِ عبور ثقافتی دیواروں سے بٹی ہوئی تھی۔ اس تبدیلی سے انسان کے وہ زمین اور خون کے رشتے بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں جو اُسے اپنے محدود ماضی سے وابستہ رکھے ہوئے تھے۔ گویا اب یہ پوری دنیا اس کا گھر اور سارے انسان اس کے بھائی ہو گئے... پہلے وہ زمین میں محصور تھا...آخر کار اُسے اپنی سَمت مل گئی اور اب وہ عالمی برداری کے تصور کی

طرف قدم بڑھا رہا ہے۔

اب اِس کا مقابلہ اقبال کے ان اشعار سے کیجیے:

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا
ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے
کھلتے نہیں اِس قلزم خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

یہاں بھی آپ کو زمان ومکان کی بندشوں کا بے باکانہ انکار ملے گا۔ اقبال نے بھی یہی کہا ہے کہ خارجی طاقتوں کے آگے بے بس ہو کر جھکنا نہیں چاہیے بلکہ اپنی داخلی قوتوں پر اعتماد قائم رکھنا چاہیے۔

اسلام جس بنیادی نظریے کی تبلیغ کرتا ہے اور اسے ساری دنیا کے مرد وزن کے ذہنوں میں بسا دینا چاہتا ہے وہ ''امن'' کا تصور ہے۔ خود لفظ ''اسلام'' جیسا کہ عربی زبان سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہے۔ ''سِلم'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہی امن وآشتی کے ہیں۔ اس مذہب کا نام ''محمڈن ازم'' نہیں ہے جیسا کہ اکثر مستشرقین غلطی سے لکھتے رہے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس مذہب کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا، بلکہ آپ کی تشریح کے مطابق یہ ایسا مذہب ہے جس کی تبلیغ کے لیے آپ مبعوث ہوئے اور جس کا نظریہ تمام بنی نوع انسان کے لیے امن وسلامتی کا حصول ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں میں تحیہ (سلام) کا معروف طریقہ ''گڈ مارننگ'' یا ''گڈ ایوننگ'' نہیں، بلکہ سَلامٌ یا ''السلامُ علیکم'' ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''تم پر سَلام (سلامتی) ہو۔'' (خواہ تم کوئی بھی ہو) یہی یہودیوں کے سلام ''شیلوم'' کا حال ہے۔ قرآن میں بھی اس مذہب کا صرف ایک ہی نام ملتا ہے اور وہ ہے ''اسلام''۔

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيْناً .

''آج میں پورا دے چکا تم کو دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے دین مسلمانی (اسلام)''[۳۱]

یا دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

''اور جب پہنچی اُن کو ایک آیت کہیں ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک ہم کو نہ ملے جیسا کچھ پاتے ہیں اللہ کے رسول۔ اللہ بہتر جانتا ہے ہاں اور عذاب سخت بدلہ حیلہ بنانے کا۔ سو جس کو اللہ چاہے کہ راہ دے کھول دے اس کا سینہ حکم برادری کو اور جس کو چاہے کہ راہ سے بھلا دے اس کا سینہ تنگ کر دے۔ گویا زور سے چڑھتا ہے آسمان پر۔ اسی طرح ڈالے گا اللہ عذاب یقین نہ لانے والوں پر۔''[۴]

اگر اس آیت کو اس تشریح کی روشنی میں دیکھا جائے جو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کریم نے لفظ 'اسلام' کے سلسلے میں پیش کی ہے تو اس سے یہ مطلب ہرگز برآمد نہیں ہوتا کہ سچی ہدایت خود بخود اُس شخص کو مل سکتی ہے جو رسمی طور پر اس مذہب سے وابستہ ہو جائے جسے 'اسلام' کہا جاتا ہے۔ اکثر مسلمان بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور کسی حد تک یہ اس حدیث کے سبب سے بھی ہوا ہے جس کا پایۂ استنا و مشتبہ ہے اور جس میں حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ ''مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلّا اللّٰه دَخَلَ الْجَنَّة'' اور جس کے مفہوم میں غالبًا یہ بات شامل سمجھ لی گئی ہے کہ ''خواہ اس کے اعمال کچھ بھی ہوں۔''

درحقیقت یہ ایک موضوع حدیث ہے کیوں کہ قرآن میں ہر جگہ عقیدہ اور عملِ صالح کو ساتھ رکھا گیا ہے اور ہر بار اعمالِ صالحہ کی ضرورت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنی کتاب ''اسلام'' میں بڑی بالغ نظری کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

''بدقسمتی سے اس تعریف کو محض 'تشریعی' مفہوم میں نہیں سمجھا گیا بلکہ بعد میں یہ بھی سمجھا جانے لگا کہ یہ اسلام کی روح کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جب باعتبار ظواہر بنیادی عقیدہ اور اخلاقی معاملات میں اتنا واضح فرق قبول کر لیا جائے گا تو ظاہر پرستی سے ملنے والے احساسِ تحفظ کے ہاتھوں دونوں ہی کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اور اس کا عام اثر عوام کے سخت رویوں پر یہ ہوا ہے کہ وہ اسلام کے رسمی اور ظاہری پہلوؤں پر اس حد تک زور

دینے لگے کہ انھوں نے اس کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو بھی تج دیا ہے۔''

اسلام ایک طرزِ حیات اور ایک نظریۂ زندگی کا نام ہے۔ یہ کچھ اخلاقی اصول واقدار پر ایمان رکھنا ہے۔ یہ ایک عالم گیر تصورِ کائنات ہے جس میں ہر انسان کو پورے اخلاص سے اپنا حصہ ادا کرنا ہے اور اس تصور کو اپنے اعمال میں رچا بسا لینا ہے تبھی وہ اپنے تئیں صحیح معنوں میں 'مسلمان' کہنے یا کہلوانے کا حق دار ہو سکتا ہے۔ اسلام کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ اس نے وہی دعوت پیش کی ہے جو انبیائے سابقین لے کر آتے رہے ہیں۔ تمام انبیاء نے اپنے اپنے زمانوں میں اور اپنے علاقوں میں دنیا کو امن کی طرف بلایا ہے۔ مادۂ لفظ 'سِلم'، جس کی طرف میں نے سطور بالا میں اشارہ کیا ایک اور مفہوم بھی رکھتا ہے اور وہ ہے خالق کی رضا کے آگے سرِ تسلیم جھکا دینا۔ یہ بھی ایک ایسا سبق ہے جسے اسلام کی طرف دوسرے نبیوں نے بھی انسان کو سکھایا اور اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مختلف زمانوں میں سارے انبیاء امن اور خیر سگالی کا ایک ہی پیغام لے کر آتے رہے ہیں۔ مگر اصلی کسوٹی عمل اور معاملت ہے محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں ہوتا۔ قرآن کہتا ہے:

''جو یقین لائے ہیں اور کی ہیں نیکیاں ان کو دے گا رحمٰن محبت۔''
(۱۹-۹۱۱)

اسلام نے اس حقیقت پر بھی زور دیا ہے کہ انسان کی صرف انفرادی حیثیت ہی نہیں ہے، بلکہ وہ انسانیت کے محیطِ بیکراں کا ایک غیر منفک حصہ ہے۔ وہ اس سمندر کا ایک قطرہ ہے مگر ایسا قطرہ جس سے پورے سمندر کو قوت اور معنویت حاصل ہوتی ہے۔

''اور ہم نے عزت دی ہے آدم کی اولاد کو اور سواری دی اُن کو جنگل میں اور
دریا میں اور روزی دی ہم نے اُن کو ستھری چیزوں سے اور زیادہ کیا اُن کو
اپنے بنائے ہوئے بہت شخصوں پر بڑھتی دے کر۔'' (۱۷-۷۰)

اُسے چاہیے کہ دوسرے افراد کے ساتھ بامعنی اور محبت پر مبنی تعلقات رکھنا سیکھے جو آزادانہ لین دین کے اصول پر استوار ہوں اور جن کی راہ میں وہ مصنوعی تفرقے حائل نہ ہو سکیں جو انسان نے اپنی جہالت یا کج اندیشی سے پیدا کر لیے ہیں۔

مکہ اور مدینہ کے جن باشندوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پیغامِ امن پیش کیا تھا ان میں زبردست مخاصمت رہی تھی اور کئی بار خونریز لڑائیاں بھی ہوئی تھیں مگر یہ آپ کی شخصیت اور تعلیمات کا معجزہ تھا کہ اسلام قبول کرتے ہی ان خوں خوار لوگوں کی کایا پلٹ گئی۔ اسلام نے صرف محبت، اخوت اور مساوات ہی کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ سبق بھی سکھایا کہ وہ اپنے اندر اور اپنے قبائل میں ایسے لوگ پیدا کریں جو دوسروں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے خود کو وقف کر دیں۔

''اور چاہیے کہ رہیں تم میں ایک جماعت بلاتے نیک کاموں پر اور حکم
کرتے پسند بات کو اور منع کرتے ناپسند کو اور پہنچے وہی مراد کو۔''
(۳-۱۰۴)

اِس تعلیم کی صدائے بازگشت ہمیں صرف مذہبی صحائف ہی میں نہیں بلکہ اس عہد کی ثقافت، شعر و ادب اور مسلمانوں کے فلسفے میں بھی ملے گی جیسا کہ یہ بلا شبہ دوسری ثقافتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اردو کے عظیم شاعر غالب نے اِس بات کو حکیمانہ ایجاز کے ساتھ یوں کہا ہے:

ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

یہ اُسی وقت ممکن ہوتا ہے جب 'اَنا' دوسروں کی 'اَنا' کے لیے لبیک کہنے والی اور بہت حساس ہو جائے۔ اُن کے دُکھ سُکھ میں شریک ہو، اُن سے قوت حاصل کرے اور انھیں قوت عطا کرے تب کہیں زندگی اپنے پورے امکانات اور صلاحیتیں ظاہر کرتی ہے۔

علامہ اقبال جو نظریۂ خودی کے علاوہ تعلیمات اسلامی کی روح اور اُس کے فلسفے کے ترجمانوں میں سے ایک ہیں، یہ مانتے ہیں کہ شریفانہ، انسانی اور پُرعزم انداز میں اپنی 'انفرادیت' پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ایک فرد اپنے تئیں اُس عظیم مجموعے کا حصہ بھی سمجھے جس میں نہ صرف تمام دنیا کے مرد و زَن بلکہ یہ ساری کائنات اور خود الوہیت کی حقیقت بھی شامل ہے۔

اُن کی دو شاہکار فارسی مثنویوں 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی' کا پیغام بھی یہی ہے کہ انفرادیت (خودی) اُس وقت تک پختہ نہیں ہو سکتی، نہ اُس کی پوری قوت بروئے کار آسکتی ہے جب تک وہ سمندر کے موتی کی طرح انسانیت کے محیط میں ڈوب کر اس کا ایک حصہ بن جائے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی سرسری طور پر اشارہ کر چکا ہوں انسان جسے عمل ارتقاء پورا کر کے ایک آفاقی انسان بننا ہے، اس وسیع و بیکراں کائنات میں کوئی غیر اہم یا حقیر ذرّہ نہیں ہے جیسا کہ وہ صدیوں سے سمجھتا آ رہا ہے بلکہ وہ اس کائنات کا مرکز اور مفہوم ہے۔ اس کے بغیر یہ کائنات بے معنی ہوتی، اور جہاں تک ہمارا علم ساتھ دیتا ہے بے جان اور سرد پڑی رہتی اگر اُسے انسان کی ذہانت، سمجھ بوجھ اور محبت نے زندگی کی یہ ہمک نہ بخش دی ہوتی۔ یہی انسان کا مقصد اعلیٰ ہے۔ یہ وہ قدریں ہیں جنھیں پرورش کرنے کی جدوجہد میں وہ زندگی بھر لگا رہتا ہے اور جو اُسے اشرف المخلوقات بناتی ہیں اور اِس بے جان کائنات کو اہمیت اور رنگ و آہنگ عطا کرتی ہیں۔ بظاہر یہ بہت بلند بانگ دعویٰ معلوم ہوتا ہے۔ یہ ساری کائنات اپنے تمام نظام ہائے شمسی، کھربوں ستاروں اور بے شمار انواع حیات کے ساتھ انسانی زندگی کے ڈراما کا صرف پس منظر ہیں۔ لیکن تمام لامتناہی بحثوں کے باوجود جواب تک اس موضوع پر ہوتی رہی ہیں سبھی بڑے مذاہب کا یہی نقطۂ نظر رہا ہے۔

انسان فضائے کائنات میں تحلیل ہو جانے والا کوئی شرار نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی اس مقصد تکوین کا ایک حصہ ہے جسے مذاہب کی اصطلاح میں ''حکمتِ الٰہیہ'' کہا جاتا ہے۔ اس دنیا میں انسان کے اعمال بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس عظیم نظام اور ضابطے کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے جو کائنات میں نظر آ رہا ہے اور جسے وہ محض 'اتفاقات' کا حیرت انگیز کرشمہ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ آپ قرآن کے لفظوں میں بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں:

> رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلاً. (اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔

اور درحقیقت یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو اسلام پیش کرتا ہے:

> وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلائِكَةِ إِنِّيْ جَاعِلٌ فِيْ الْأَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْا أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَن يُفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّيْ أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُوْن.
>
> ''اور جب کہا ترے رب نے فرشتوں کو، مجھ کو بنانا ہے زمین میں ایک نائب۔ بولے: کیا تو رکھے گا اُس میں جو شخص فساد کرے وہاں اور کرے

خون۔ اور ہم پڑھتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات
کو۔ کہا مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔'' [۵]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا نے اپنے ارادے کا اعلان کیا کہ وہ انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا تو اس کے فرماں بردار فرشتوں نے اس فیصلے کے خلاف دبے لفظوں میں احتجاج کیا اور کہا کہ انسان زمین پر خون بہائے گا اور فساد برپا کرے گا جو اُسے وراثت میں ملا ہے۔ اس پر ارشادِ باری ہوا: ''إِنّی أعَلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ'' (میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔) یعنی وہ ایسا کر تو ضرور سکتا ہے کیوں کہ اُسے خیر و شر میں تمیز کا اختیار دیا جائے گا مگر اس میں یہ بھی صلاحیت ہے کہ وہ ساری کائنات کو حسن اور خیر سے مملو کر دے اس میں معنویت پیدا کر دے اور اس طرح زمین پر خدا کے مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہو'' اپنی ایک خوبصورت نظم میں جس کا عنوان ''میلادِ آدم'' ہے۔ اقبال نے کائنات میں انسان کے رول کے اس عظیم ڈرامے کو اس طرح پیش کیا ہے اور یہ قرآن کے مجموعی انداز فکر سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد
خبرے رفتا زگردوں بہ شبستانِ ازل
حدر اے پرگیان، پردہ دئے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات
چشم واکرد، دجہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عصر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

اس طرح انسان عالم ناسوت ولاہوت دونوں میں شریک ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وہ تمام مخلوقات میں شامل ہے جن میں عالم نباتات بھی ہے، جسے ابھی کچھ زمانہ پہلے بے جان مانا جاتا تھا،

دوسری طرف وہ عالمِ ملکوت کو پانے کا خواہش مند ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُس کے خمیر میں شیطنت اور ملکوتیت کا حیرت انگیز امتزاج بھی ہے یعنی ایک طرف تخلیق وتعمیر کی قوتیں ہیں تو دوسری جانب تخریب وفساد کی۔ ورثے میں ملے ہوئے یہ تضادات ہی کائنات میں اُس کے ڈرامائی رول کا تعین کرتے ہیں اور یہی اس کی زندگی کے کامیاب یا المناک ہونے کا راز ہیں اور اِسی راز کو سمجھنے سے فرشتے قاصر رہے تھے۔ قرآن کے الفاظ میں:

> إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولا.
>
> ''ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اُس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔''[۶]

اس کے ساتھ ہی قرآن نے انسان کی دورُخی تقدیر کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

> ''ہم نے بنایا آدمی خوب سے خوب اندازے پر پھر پھینک دیا اُس کو نیچوں سے نیچے مگر جو یقین لائے اور کیں بھلائیاں سواُن کے لیے نیکیاں ہیں بے انتہا۔''(۹۵:۳-۶)

بالفاظِ دیگر وہ اعلیٰ ترین بلندیوں تک پرواز کرسکتا ہے کیوں کہ اللہ نے اُسے 'احسنِ تقویم' سے پیدا کیا ہے اور دوسری طرف 'اسفلِ سافلین' میں بھی گرسکتا ہے اگر وہ اپنے اس اختیارِ تمیزی کا استعمال نہ کرے جو اُسے خیر کو فروغ دینے کے لیے عطا کیا گیا ہے۔ چاہے اُس کا اظہار نیکی کے محدود مفہوم میں ہو یا اُن وسیع تر معنوں میں جن میں صداقت، حسن اور محبت سبھی شامل ہیں۔ انسانی فطرت کی اِس دورُخی کو بہت سے بالغ نظر مفکروں اور مصنفوں نے پہچانا ہے۔

> ''اعمالِ انسانی کا ایک بڑا حصہ خوبصورتی کو مسخ کرنے، صداقت کو خورد بُرد کرنے، انصاف کو ناکام اور خیر کو بے راہ بنانے پر منتج ہوتا ہے۔ اُلوہی صفات رکھنے والی اس مخلوق میں ایک شیطان بھی چھپا ہوا ہے۔ باین وجہ

انسان کی زندگی اپنی الوہی صفات کے باوجود اعمال وافکار میں دائمی
تضادات کا شکار ہے۔''

مذہب کا کام ایک طرف تو اِن تضادات کو دور کر کے انسان کو اوپر اٹھانا ہے۔ دوسری طرف اس آفاقی انسان کے نشو ونما کو فروغ دینا ہے جو اس قید خانے کی اُن دیواروں کو توڑ سکتا ہے جو اس کی روح کا تابوت بن گئی ہیں تب کہیں جا کر وہ حقیقی انسانی آزادی کی صبح میں آنکھیں کھول سکے گا جہاں تمام انسان ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کی طرح برتاؤ کرتے ہوں اور آپس میں ہمدردی، رفاقت اور منصفانہ برتاؤ کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ مذہب اس مقصد کو صرف اس طرح حاصل کرنا نہیں چاہتا کہ اِن صفات کے پسندیدہ ہونے کی تبلیغ کو کافی سمجھ لے، اتنا تو بسا اوقات فلسفی، سیاسی مفکرین یا خیال پرست مصنفین بھی کرتے رہتے ہیں۔ مزید برآں مذہب نے اپنے بانیوں اور بعض برگزیدہ پیروکاروں کی زندگی میں نئے انداز کی شخصیت کا مثالی نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ حضرات کسی حد تک زمان ومکان کی قیود سے ماورا ہیں جن میں ان کے معاصرین زندہ تھے، کام کرتے اور سوچتے تھے یا اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ایسی مثالی شخصیات کا اثر صرف لفظوں میں بیان کیے ہوئے خیالات سے کہیں زیادہ گہرا اور پائیدار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی بدولت نا قابلِ یقین تیزی کے ساتھ پورے عہد کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اگر بنی نوعِ انسان میں انقلابی تبدیلیاں لانے کے لیے صرف خیالات ہی کافی ہوا کرتے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بعض غیر مذہبی مفکرین نے بھی اتنے ہی گہرے خیالات کا اظہار کیا ہے جیسا انسان کے عظیم مذہبی مفکرین کرتے آئے ہیں مگر یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ اول الذکر طبقے کی اخلاقی گرفت بھی مذہبی رہنماؤں کے اثر کی طرح مضبوط اور دیرپا رہی ہے۔ دنیا میں انقلابی تبدیلیاں لانا صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب خیالات، اقدار، ایقان اور نا قابلِ شکست عقیدہ کسی کی شخصیت میں رچ بس جاتے ہیں اور اس کی زندگی دائمی طور پر اس سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

مہاتما بدھ، عیسیٰ مسیح، کرشن جی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آفاقی انسانوں کے اِسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حضرات اب ہندی یا فلسطینی یا عربی، کالے، سرخ یا گورے نہیں ہیں۔ یہ اپنے اپنے انداز کی حقیقی شخصیت بن چکے ہیں اور نہ صرف اپنے عصرِ حاضر کے پیروکاروں کو بلکہ نا آفریدہ نسلوں

کو بھی ترغیب دے رہے ہیں کہ وہ بھی اپنی روایت کی زنجیریں توڑ کر ایسی ہی ''شخصیت'' بنالیں اور یوں اُس تاب ناک منزل کی طرف قدم بڑھاتے رہیں جو ابھی تک خاصی دور نظر آتی ہے۔ یہ پیش قدمی انھیں اپنی بہت سی انجانی صلاحیتوں کا احساس کرنے کے قابل بناتی ہے۔ جب رسول اکرمؐ کی مثالی شخصیت اور آپ کا اُسوۂ حسنہ باطل کی نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز ہوتا ہے تو وہ اپنے حقیر اور ناپائیدار مقاصد اور تمناؤں کو بھول جاتے ہیں جن سے اب تک اپنی زندگی کو معمور کیے ہوئے تھے اور اس دشوار گزار اور سختیوں سے بھرپور راستے کو ترجیح دینے لگ جاتے ہیں جس کی طرف پیغمبر کی آواز اور آپؐ کی اپنی مثال بلا رہی ہے۔ یہی اُن بہت سے حضرات کے ساتھ بھی ہوا ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ سنّیہ کا اتباع کیا۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اُن حیرت انگیز تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو ایسے حضرات کی زندگیوں میں رونما ہوئیں اور اس غیر معمولی اثر کو ظاہر کرنے کے لیے ایک شعر بھی درج کیا ہے۔

درحقیقت زمانے کا بے رحم برتاؤ اور مخالف قوتیں اس ضیا پاش تصور کو دھندلا کر دیتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کارنامہ غیر متعلق امور میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں وہ لوگ بھی جو خاص طور سے مذہبی اقدار کے تحفظ کے لیے خود کو وقف کر دیتے ہیں، باطن کو ظاہر پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کا وہ المیہ ہے جو ہمیشہ دُہرایا جاتا رہا ہے لیکن اس سے پیدا ہونے والی قوت محرکہ نہ صرف اس مذہب کے پیروؤں کی تہذیب اور نظام سیرت میں نفوذ کر جاتی ہے بلکہ وہ پوری انسانی میراث کا ایک حصہ اور کبھی کبھی شعوری طور پر محسوس نہ ہو سکنے والا سرمایہ بن جاتی ہے اور انسان کی ایک بڑی جماعت کو براہِ راست یا بالواسطہ متاثر کرتی رہتی ہے۔

اب ہمیں آفاقی انسان کے اس تصور کی بازیافت کرنا ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے اور جو بعد کو ادب کے غیر مذہبی سرمایے میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں اس فریب سے بچنا بہت ضروری ہے کہ یہ نظریہ تنہا اسلام ہی کی ملکیت ہے اور کسی دوسرے مذہب نے اس طرح کا تصور کسی دوسرے انداز یا درجے میں پیش نہیں کیا ہے، یا جو بات اس سے بھی زیادہ گمراہ کن ہو سکتی ہے وہ یہ کہ اس سے ''حقیقی مسلمان'' مراد ہے۔ یہ تو صرف تخیل پر مبنی ایک تمثیل ہے کہ آفاقی انسان کا لباس زیب تن کر کے ایک اچھا انسان کیسے بن سکتا ہے اور یہ مقصود ہے کہ جس کی طرف ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کو پورے خلوص کے ساتھ

جدوجہد کرنی چاہیے۔ اسلام نے اس ارتقاء کے لیے کام بھی کیا ہے اور جدوجہد بھی۔ خلاصہ یہ کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہونے کا دعویدار ہے اور اس لحاظ سے وہ ایک ایسا مذہب ہے جو دوسرے ادیان اور ان کے بانیوں میں بھی صداقت کے عنصر کو تسلیم کرتا ہے اور اس صداقت کو اپنے اندر جذب بھی کرتا ہے۔ اس نے اپنے تصور کو لازماً کسی قوم یا نسل یا کسی جغرافیائی علاقے کے ساتھ محدود نہیں کیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے آئیڈیل انسان میں بھی اسی نظریے کا عکس دیکھنا پسند کرے گا۔

سب سے پہلے تو یہ آفاقی انسان تسلیم ہی نہیں کرتا کہ فروعی اختلافات اور حد بندیاں جن میں ہم اُلجھے ہوئے ہیں، کوئی وقعت رکھتے ہیں کیونکہ یہ اُس کے انسانی وفاداری اور خیر سگالی کے وسیع تر تصورات سے ٹکراتے ہیں۔ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے گا اور غیر مسلموں سے بھی برتاؤ کرنے یا ان کو پرکھنے کے لیے ایک ہی معیار استعمال کرے گا۔ یہ نہیں کہ اپنوں کو جانچنے کے لیے کسوٹی کچھ ہو اور دوسروں کو آنکنے کی کچھ اور۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤدُّواْ الأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعاً بَصِيْرا.

''اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔''[۷]

انسان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سب انسانوں (الناس- بنی نوعِ انسان) سے منصفانہ سلوک کرے۔ خوش معاملگی صرف وہ نہیں ہے جو اپنے ہم مذہبوں سے کی جائے۔ کسی بھی طرح کے حالات میں کسی سے بھی ناانصافی کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ خواہ وہ بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ كَانَ النّاس اُمَّةٌ وَاحِدَةٌ (۲-۱۲۳) تمام انسانم ایک ہی امت ہیں اور جو اختلافات انھیں گروہوں میں بانٹ دیتے ہیں وہ یا تو اتفاقی یا پھر اس لیے ہیں کہ اس اختلاف سے وہ پہچانے جاسکیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيْمٌ

خَبِیْر.

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''[۸]

دوسرے موقع پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان نہ صرف اپنے والدین اور رشتے داروں کے ساتھ احسان (نیکی، مہربانی، تکریم) کا برتاؤ کرے بلکہ دوسرے یتیموں، ضرورت مندوں، محتاجوں اور ہمسایوں کے بھی کام آئے خواہ اُن سے کوئی رشتہ ناتا ہو یا نہ ہو۔ (سورۂ بنی اسرائیل ۲۴ تا ۲۷) اس فرمان کی تائید مزید ایک حدیث سے ہوتی ہے:

''مومن وہ ہے جو کسی کے ساتھ دھوکہ دھڑی نہیں کرتا۔ بلکہ سچا مومن (یعنی سچے عقیدے والا جس کا مرتبہ رسمی 'مسلم' سے برتر ہے) وہ ہے جو اپنے ہمسائے سے بھی دغا نہ کرے اور جس سے وہ خود کو مامون سمجھیں۔''

یہاں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اس کے تمام ہمسایے اُس سے مطمئن اور مامون ہوں اور انھیں یہ اندیشہ بھی نہ ہو کہ اس سے انھیں کوئی شر پہنچے گا۔ اس طرح ساری کائنات ایک دوسرے پر انحصار کرنے کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ہمسایہ بن جاتی ہے اور جو لوگ ہم سے دور بھی بستے ہیں وہ بھی ہمارے پڑوسی کہے جاسکتے ہیں۔ اسلام اگر صحیح معنوں میں کسی شخص کی زندگی پر اثر انداز ہوجائے جو افسوس ہے کہ آج کل نہیں ہے، تو اس کے برتاؤ اور نظریات میں ایک انقلابی تبدیلی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر اسلام کا بنیادی پیغام تمام انسانوں کی زندگی میں سرایت کر جائے، یا کم از کم ایک قابلِ لحاظ تعداد کو متاثر کردے تو اُسے بالکل نئی شان وشوکت مل سکتی ہے کیوں کہ بہرحال بنی نوع انسان کے مصائب اور مشکلات کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم دوسرے لوگوں تک وہ اچھا اور منصفانہ برتاؤ پہنچانے میں ناکام رہے ہیں جو اُن کا حق ہے۔ یہی وہ بات ہے جو انسان کی ''کلیت'' کو اخلاقی اور سماجی اعتبار سے بٹے ہوئے انسان سے نمایاں طور پر جدا کردیتی ہے۔ یہ صرف افراد کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ اجتماعی اور قومی رشتوں پر بھی صادق آتا ہے اور یہ ایک ایسا ضروری حکم ہے جس میں کسی رعایت پر سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تُحِلُّواْ شَعَآئِرَ اللّهِ وَلاَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلاَ الْهَدْيَ وَلاَ الْقَلآئِدَ وَلا آمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَاناً وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُواْ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُواْ وَتَعَاوَنُواْ عَلَى الْبرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُواْ اللّهَ إِنَّ اللّهَ شَدِيْدُ الْعِقَاب.

''اس گروہ نے جو تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے اس پر تمہارا غصہ تمھیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی اُن کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ نہیں جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں اُن میں سب سے تعاون کرو۔ اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو اس کی سزا بہت سخت ہے۔''[۹]

کسی کو دوسرے شخص یا قوم کے ساتھ اس بنا پر غیر منصفانہ برتاؤ کرنے کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اس کا دشمن ہے خواہ اس نے مسلمان کو کعبے میں داخل ہونے سے روکا ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارا فرض ہے کہ خیر کے ہر کام میں تعاون کریں چاہے وہ مسلمان سے سرزد ہو یا غیر مسلم سے اور جس بات میں شر کا پہلو ہو خواہ وکسی سے بھی سرزد ہو رہی ہو اُس سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ مندرجۂ ذیل آیت میں یہی اصول بیان ہوا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِيْنَ لِلّهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُواْ اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُواْ اللّهَ إِنَّ اللّهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ.

''کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔''[۱۰]

یہ آیت ہمیں حکم دیتی ہے کہ ہم حق کے لیے ایک جری گواہ بن جائیں اور کوئی اس راہ سے

ہمارے قدم نہ ڈگا سکے اور انصاف کرنے کے معاملے میں ذاتی دوستی یا دشمنی .... بالائے طاق رکھ دیں۔خواہ ہم مصنف ہوں یا گواہ، تمام معاملات میں ہمارے کردار کا رہنما اصول یہی ہونا چاہیے۔اس سے بھی یہ مستنبط ہوتا ہے کہ قومیت کا جو تصور عہدِ حاضر کے ذہن پر گزشتہ دو صدیوں سے قبضہ جمائے ہوئے ہے شاید تمام خوبیوں کا جامع نہیں ہے نہ یہ کوئی ایسی چھتری ہے جس کے سایے میں ہر وہ بات آجاتی ہے۔

اس آفاقی انسان میں اتنی ہمت ہونی چاہیے کہ دنیا کی کسی بھی تہذیب میں یا کسی بھی خطّے میں نیکی کے حصول کے لیے پہنچ جائے۔ایک مشہور حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> **الحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤمِنِ يأخُذَهَا أَينَمَا وَجَدَهَا.** ''دانائی مومن کی متاع گمشدہ ہے جہاں بھی اُسے پائے اپنا لے۔''

اس کی ہمدردی، اثر پذیری اور اخذ و تاثیر کی صلاحیت پر کوئی حد بندی نہیں ہے۔یہی ایک فرد کی حیثیت سے اُس کے ذی استعداد ہونے کی نشانی ہے اور دوسری قوموں یا تہذیبوں کی قدر کرنے کی بنیاد بھی صحیح معنوں میں یہی ہے۔ایک بار یہ روشنی اُسے نظر آجائے تو پھر کسی خوف یا مصلحت سے وہ اُسے چھپاتا نہیں بلکہ کھلے عام اسے اس میں حصہ لینے کے لیے اپنے ساتھیوں اور گھر بار سمیت میدان میں آجاتا ہے اور یہ پروا نہیں کرتا کہ اِس میں اُس کا انجام کیا ہوگا؟ یہی وہ بات ہے جس کا مطالبہ خدا نے تمام انبیائے سابقین سے بھی کیا تھا اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی ارشاد ہوا تھا:

> **يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَهْدِىْ الْقَوْمَ الْكَافِرِيْن.**
>
> ''اے پیغمبر جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچادو۔اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبر کا حق ادا نہ کیا۔اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے، یقین رکھو وہ کافروں کو کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔''[11]

پیغمبر ایک عظیم الشان آفاقی انسان ہوتا ہے خواہ وہ نہ یہ بات جانتا ہو نہ اس کا دعویٰ کرتا ہو۔ وہ اپنے اطراف کے جغرافیائی اور تاریخی حالات میں محصور ہوسکتا ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے فرمایا ''مجھے اللہ نے صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا ہے۔'' شوئیٹزر (Schweitzer) نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''یہ خیال ایک ایسے مقامیت زدہ اور مرتکز کلچر کی پیداوار ہے جس کے ذہن پر ایک مسیح علیہ السلام کی وساطت سے قومی نجات پانے کا خیال چھایا ہوا تھا۔'' مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو سچائیاں انھوں نے پیش کیں اور جن قدروں کی حمایت کی ان کا دائرۂ اثر بہت وسیع تھا۔ خود مسیح علیہ السلام نے اپنے دل میں کسی خاص گروہ سے کسی طرح کی برأت کے احساس کی پرورش نہیں کی تھی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بالکل ہی غیر مبہم لفظوں میں اعلان کر دیا تھا:

> ''اے رسول کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف (بھیجا ہوا) اس خدا کا نبی ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔''[۱۲]

دوسرے موقع پر ارشاد ہوا:

> وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ. ''(اے رسول) اور ہم نے تمھیں نہیں بھیجا مگر تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر۔''[۱۳]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول کے پیغام کا لبِّ لباب جسے قرآن ''دین'' کی اصطلاح میں یاد کرتا ہے، اس کا تخاطب کسی خاص گروپ یا علاقے یا ملک کی طرف نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان سے ہے۔ چوں کہ خدا ساری کائنات کا حاکم ہے اس لیے ظاہر ہے اس کا وہ پیغام بھی جو رسول پر وحی کیا گیا سب کے لیے ایک ہی ہونا چاہیے۔ آفاقی انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے اندر حق کی وکالت کرنے کی جرأت پیدا کرے اور بسم اللہ کے گنبد میں بند رہ کر عافیت جوئی کی عادت کو چھوڑ دے اور اس وحشی دنیا کے کارزار میں کود پڑنے کے لیے خود کو آمادہ کرے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اسلام نے دوسرے تمام مذاہب، ان کے رہنماؤں اور عبادت گاہوں کے لیے احترام کا اظہار کرنا مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ اگر کوئی مسلمان ایسا نہیں کرتا تو گویا وہ اپنے عقیدے کے ایک بنیادی اصول کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا

ہے اور اسے اپنے طریق عمل کے لیے قرآن یا اسوۂ رسول سے کوئی جواز نہیں مل سکے گا۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ میں کچھ ایسے بھی مسلم بادشاہ یا دوسرے صاحبان اقتدار گزرے ہیں جنھوں نے ایسے احترام کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن وہ اپنے اعمال کے لیے خود ذمہ دار ہیں، جس طرح دوسرے مذاہب کے پیروا گر ایسا توہین کا رویہ اختیار کریں تو یہ ان کا انفرادی عمل سمجھا جائے گا۔ قرآن کا اس سلسلے میں واضح فرمان یہ ہے:

> اور یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں مت دو ورنہ کہیں یہ بھی حد سے تجاوز کر کے اپنی جہالت کی وجہ سے اللہ کو گالیاں نہ دینے لگیں۔ ہم نے اسی طرح ہر جماعت کے لیے اس کے عمل کو زینت بنا دیا ہے پھر انھیں اپنے رب کی طرف ہی لوٹنا ہے، اس وقت وہ انھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔[۱۴]

اسلام یہ مانتا ہے کہ تمام بڑے مذاہب حصول حق کی طرف دلالت کرتے ہیں اور ان مذاہب کے بانیوں نے ان کے مختلف پہلو دکھائے ہیں۔ اس لیے ان کے درمیان کوئی معاندانہ تفریق نہیں کی جانی چاہیے۔ کسی دوسرے مذہب نے ایسی تاکید اور تکرار کے ساتھ اس انقلابی سچائی کا اعلان کبھی نہیں کیا مگر قرآن میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں جو احترام کو اسلام کے عقیدے کا جزو لاینفک بنا کر پیش کرتی ہیں۔

> قُولُواْ آمَنَّا بِاللّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُون.
>
> ''اے مسلمانو! کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی۔ اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے کی تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق

نہیں کرتے اور ہم اللہ کے آگے تسلیم وانقیاد کرتے ہیں۔[۱۵]

یہ حکم بیک وقت مثبت بھی ہے اور منفی بھی۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيْدُونَ أَن يُفَرِّقُواْ بَيْنَ اللّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيْدُونَ أَن يَتَّخِذُواْ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيْلاً. أُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقّاً وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ عَذَاباً مُّهِيْناً. وَالَّذِيْنَ آمَنُواْ بِاللّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُواْ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُوْلَـئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ أُجُورَهُمْ وَكَانَ اللّهُ غَفُوراً رَّحِيْماً.

''جولوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے مابین تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے اور کفر وایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ سب پکّے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انھیں ذلیل وخوار کر دینے والی ہوگی۔ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[۱۶]

(ماخوذ: اسلام اور عصر جدید [جولائی ۱۹۷۷ء] جلد:۹، شمارہ:۳)

حواشی

۱۔ سورہ المائدہ:۵-۱۰۴
۲۔ ایضاً:۱۰۵
۳۔ ایضاً:۳
۴۔ سورہ الانعام:۶-۱۲۵
۵۔ سورہ البقرۃ:۲/۳۰
۶۔ سورہ الاحزاب:۳۳-۷۲
۷۔ سورہ النساء:۴/۵۸
۸۔ سورہ الحجرات:۴۹/۱۳
۹۔ سورہ المائدہ:۵/۲
۱۰۔ ایضاً:۵/۸
۱۱۔ ایضاً:۵/۶۷
۱۲۔ سورہ الاعراف:۱۵۸
۱۳۔ سورہ الانبیاء:۲۱-۱۰۷
۱۴۔ سورہ الانعام:۶-۱۰۹
۱۵۔ سورہ البقرہ:۲/۱۳۶
۱۶۔ سورہ النساء:۴/۱۵۲-۱۵۰

ڈاکٹر محمد خالد خاں *

عہد وسطیٰ میں ہندوستانی مسلم مؤرخین کی وقائع نگاری
منتخب التواریخ کے خصوصی حوالے سے

تاریخ عربی زبان کا لفظ ہے اور اپنی اساس میں ارخ سے ماخوذ ہے جس کے معنی دن (عرصہ وقت وغیرہ) لکھنے کے ہوتے ہیں۔ اصطلاح میں اعمال وافعال، حادثات وواقعات کا ذکر جنھیں زمانے کے قریب کے لحاظ سے منظّم ومرتب کیا گیا ہے۔ کب، کہاں، کیوں یہ وہ سوالات ہیں جو تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔

علوم کے میدان میں تاریخ کا اپنا مقام ہے، بالخصوص دورِجدید میں جب اجتماعی اور معاشرتی علوم نے ایک خاص اہمیت اختیار کر لی ہے تو اس میں تاریخ کی اور زیادہ اہمیت بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں قدیم اور جدید تاریخ نگاروں میں جو خاص فرق آیا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے دور میں تاریخ کو شخصیات کے حساب سے لکھا جاتا تھا جبکہ آج کے دور میں تاریخ علوم وفنون اور عوام الناس کے حساب سے لکھا جانا پسند کیا جاتا ہے۔

تاریخ ایک ایسا مضمون ہے جس میں ماضی میں پیش آنے والے لوگوں اور واقعات کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں۔ تاریخ دان مختلف جگہوں سے اپنی معلومات حاصل کرتے ہیں جن میں

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵ ای میل: mkhan45@jmi.ac.in

قدیم نسخے، شہادتیں اور پرقدیم چیزوں کی تحقیق شامل ہے۔البتہ مختلف ادوار میں مختلف ذرائع معلومات کو اہمیت دی گئی ہے۔

تاریخ انسان کی یادداشت کا وہ بیش بہا خزانہ ہے جس پر چل کر انسان اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔تاریخ صرف اور صرف انسانی ذہن کی یادوں کو محفوظ کر کے اور اس کی قوت حافظہ کا تحفظ کرتے ہوئے انسان کو ایک ایسا راستہ فراہم کرتی ہے جس پر چل کر وہ اپنی منزل پا سکتا ہے۔

علم تاریخ کی اپنی تاریخ بہت پرانی ہے۔جب سے انسان دنیا میں آیا تاریخ کا آغاز اسی دن ہی سے ہو گیا تھا۔تاریخ کی اہمیت اور مقصدیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں انبیاعلیہم السلام کے تاریخی واقعات کثرت سے بیان فرمائے ہیں، جس سے انبیاء کے حالات اور ان کے دور کا علم حاصل ہوتا ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ علم تاریخ ایک ایسا علم ہے جس کا آغاز انسان کے ساتھ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں تاریخی واقعات کو بیان کیا جس سے بنی نوع انسان کو نبیوں کی گزری ہوئی زندگی اور اقوام کا علم ہوا۔لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ علم تاریخ ایک ایسا علم ہے جو اپنے اندر ایک مقصدیت اور معنی رکھتا ہے۔تاریخ کے بغیر کوئی قوم، کوئی نسل اور کوئی انسان مکمل نہیں ہے بلکہ تاریخ کے بغیر دنیا کا ہر علم ناکافی ہے۔

تاریخ واقعات کا مجموعہ ہے لیکن ہر واقعہ تاریخ نہیں ہوتا۔ہم صبح وشام بہت سے اعمال سر انجام دیتے ہیں لیکن ہر واقعہ کو تاریخ کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ان ہی واقعات کو تاریخی واقعات کہا جائے گا جس کا اثر ایک بڑی مجموعی آبادی پر رونما ہو۔اسی سلسلے کی ایک کڑی وہ کتابیں ہیں جو عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلم مؤرخین و وقائع نگار کے ذریعہ تصنیف وتالیف کی گئیں۔ان میں چند وہ تاریخی کتابیں ہیں جنھوں نے عالمی شہرت حاصل کیں اور جن کے ذریعہ دنیا نے ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی، ثقافتی، علمی وفکری کارناموں سے واقفیت حاصل کی۔مثلاً ابوریحان البیرونی کی کتاب الہند، قاضی محمد اسماعیل بن علی کی فتح نامہ سندھ المعروف بہ چچ نامہ، حسن نظامی نیشاپوری کی تاج الماثر، عبدالملک عصامی کی فتوح السلاطین، شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی، منہاج سراج جوزجانی کی طبقات ناصری، امیر خسرو کی خزائن المفتوح، یحییٰ بن احمد سرہندی کی تاریخ مبارک شاہی اور عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ وغیرہ نہایت اہم کتب ہیں جو ہندوستانی

معاشرے کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ان مسلم مؤرخین کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے صرف مختلف سلطنتوں کے عروج وزوال کو بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مختلف ادوار کے واقعات کو بھی قلم بند کیا اور ساتھ ہی ہندوستان کے بین مذہبی معاشرہ، رسوم ورواج، شادی بیاہ کے طور طریقوں اور لوگوں کے معاشی واقتصادی حالات کو بھی درج کیا ہے، نیز مسلم حکمرانوں کی فتوحات، انتظامی صورتِ حال اور عدالتی نظام وغیرہ سے بھی بحث کی ہے۔

اس مقالے میں اسی پس منظر میں عہد وسطیٰ کے چند معروف مسلم مؤرخین اور ان کی خدمات کا مطالعہ مختصراً اور بالخصوص منتخب التواریخ کا مطالعہ وتعارف قدرے تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے کہ ہندوستان کی تاریخ میں منتخب التوارخ مختلف وجوہ سے بڑی اہمیت کی حامل کتاب تصور کی جاتی ہے۔

چچ نامہ

چچ نامہ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کے تاریخی ادب میں اپنی سبقت زمانی کے اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ کتاب چچ نامہ قاضی محمد اسماعیل ابن علی کی تالیف ہے، جو سندھ کی فتح کے بعد محمد بن قاسم کی طرف سے اروڑ کے قاضی مقرر کیے گئے تھے۔[۱]

چچ نامہ تاریخ سندھ کی اولین کتاب ہے۔ یہ عربی زبان میں لکھی گئی تھی۔ عام تاثر یہ ہے کہ اس کا فارسی ترجمہ غالباً ۶۱۳ھ میں ہوا ہوگا۔ لیکن اصل عربی کتاب کا نہ تو اب کوئی نسخہ موجود ہے اور نہ ہی مصنف کا نام معلوم ہے۔ کتاب کے فارسی مترجم علی کوفی تھے جو دیگر علماء کی طرح منگولوں کے حملے کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر امن کی تلاش میں ہندستان آئے تھے۔ بابا فرید شکر گنج کے آباؤ اجداد بھی اسی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آئے تھے۔ قلندر لعل شہباز بھی اسی طرح اپنا آبائی شہر مرو چھوڑ کر پہلے ملتان آئے، پھر سیوہن میں سکونت پزیر ہوے۔ سلطنت سندھ اُس زمانے میں سات اقلیم پر مشتمل تھی۔ سیوہن ایک اہم اقلیم تھا۔ آج سیوہن غالباً سندھ کا سب سے قدیم شہر ہے جو اب تک سانس لے رہا ہے۔ سکندر اعظم نے اس میں چھ ماہ قیام کیا تھا اور قدیم قلعے کی مرمت کرائی تھی۔ برطانوی دور حکومت میں شائع شدہ گزیٹیئرز میں لکھا ہوا ہے کہ مہابھارت کی جنگ کے زمانے میں سیوہن اپنے عروج پر تھا۔ چچ نامہ کا فارسی

مترجم علی کوفی جب ہجرت کر کے ہندوستان آیا تو سندھ کی ہفت اقلیم سلطنت کا حاکم ناصر الدین قباچہ تھا، جو ملتان میں رہتا تھا۔ اس نے علی کوفی کی سرپرستی کی۔ قباچہ کی حکومت کا دور ۶۰۲ھ سے ۶۲۵ھ تھا۔ علی کوفی کے فارسی ترجمے سے ہی آگے چل کر چچ نامہ کے سندھی، اُردو اور انگریزی تراجم ہوئے۔[۲]

کتاب الہند و قانون مسعودی

کتاب الہند ہندستانی تاریخ اور ہندوستانیت کے ابتدائی لٹریچر کے طور پر ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس کا مصنف ابوریحان البیرونی ہے۔

ابوریحان محمد بن احمد البیرونی الخوازمی (جو یورپ میں علی بورون کہلاتا ہے) واقعی ایک نہایت دانشور شخص تھا۔ یہ مشہور قاموسی عالم، فلسفہ، ریاضی، نجوم، جغرافیہ، طب، منطق، دینیات اور مذہب سے خوب اچھی طرح واقف تھا، اور اُسے پہلا نیز عظیم ترین ماہر ہندوستانیاست کہا جائے تو مناسب ہے۔

اس کا سب سے پہلا سوانح نگار (شمس الدین محمد شہرازوری) اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اسے مطالعے کی بڑی عادت تھی اور ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ وہ سال میں صرف دو دفعہ کتاب اور قلم چھوڑتا تھا، ایک نوروز موسم بہار میں سال نو کا پہلا دن) پر اور دوسرے مہراجن (موسم خزاں) پر "جب رسول خدا کے احکام کے مطابق، بس اس قدر ضروریات زندگی فراہم کرنے میں مصروف رہتا تھا جو قیام حیات اور تن پوشی کے لیے کافی ہوں، وہ محمود کے پیچھے پیچھے ہندوستان میں بہت گھوما پھرا اور ہندوؤں کے فلسفے، عوام اور زبان کا بڑا مطالعہ کیا اور اس زمانے کے ہندوؤں کے سماجی اداروں نیز مذہبی حالات کے بارے میں جو مشاہدے کیے ان کو اپنی مشہور زمانہ کتاب (کتاب الہند) میں قلم بند کر لیا۔ (۱۰۱۷ تا ۳۰) نیز البرونی نے سلطان محمود غزنوی کے بیٹے سلطان مسعود کی بڑی تعریف کی اور اپنی قانون مسعودی اس کے نام معنون کی، کیونکہ مسعود نے مصنف (جو اس وقت ۶۱ برس کا تھا) کو ایک خاص انعام (پنشن) عطا کر کے اس لائق کر دیا تھا کہ وہ اپنا وقت علمی کاموں میں صرف کر سکے۔ اس لیے وہ بڑے فخر سے لکھتا ہے کہ مسعود نے اس پر عنایات کیں اور اس کو اور اس کی تحقیقات کو مدد بہم پہنچائی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ البیرونی جیسے شخص کا نظریہ بھی ذاتی مفاد سے متاثر ہو گیا تھا۔[۳]

تاج المعاصر

ہمیں تاج المعاصر (کارناموں کا سرتاج) کے مصنف حسن نظامی کے بارے میں سوائے ان حوالوں کے کچھ نہیں معلوم جو اس نے خود اپنی کتاب میں دیے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو غلام ابن غلام حسن نظامی کہتا ہے اور اپنے سر پرستوں میں ابوالمظفر محمد بن سام بن حسین یعنی محمد غوری اور قطب الدنیا والدین ابوالحارث ایبک کے نام لیتا ہے۔ حسن نظامی نیشاپور میں پیدا ہوا تھا اور اسے صدرالدین محمد بن حسن نظامی بھی کہا جاتا ہے۔ پروفیسر عسکری کے مطابق اس کا باپ غالباً ابوالحسن نظامی عروضی تھا جو سمرقند کا رہنے والا تھا۔ گولاہور نہ اس کی جائے پیدائش تھی اور نہ مستقل مسکن پھر بھی ہمیں اس کا تعلق اسی شہر سے بتاتا ہے۔ اسے خراسان کے سیاسی ہنگاموں کے باعث اپنا آبائی وطن چھوڑ کر غزنہ کے راستے دہلی آنا پڑا۔ اس زمانے کے خراسان میں نہ لیاقت کو سراہا جاتا تھا اور نہ اس کا اجر ملتا۔ تحریر کرتے وقت وہ گہرے احساس محرومی کا شکار تھا۔ حسن نظامی کے تعلقات اور واقفیت (صوفی محمد شیرازی اور غزنہ کے قاضی القضاۃ مجد الملک، اور دلی کے قاضی القضاۃ شرف الملک) سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف نہایت اہل علم تھا اور دانشوروں میں شمار کیا جاتا تھا بلکہ سماجی نظام میں خاصی اونچی حیثیت کا مالک تھا۔ اس نے اپنی اس فارسی کتاب کی ابتدا ۶۰۲ھ مطابق ۱۲۰۵ء نہ صرف اپنے دہلی کے (جہاں عربی قلم کی بظاہر قدر نہ تھی) دوستوں کی درخواست پر کی تھی بلکہ اس شاہی حکم کو پورا کرنے کے لیے بھی کی تھی جس میں اس سے کہا گیا تھا کہ فاتح حکومت فرماں روا کا نام نہیں دیا گیا ہے، واقعات کی تفصیلات قلم بند کرے۔ اس میں جزوی طور پر محمد غوری (۱۱۹۱ء سے) کی اور خاص طور سے قطب الدین ایبک اور التمش کی تاریخ رقم کی گئی ہے۔ مصنف نے ہر ہر قدم پر اپنے رنگین اور طولانی انداز میں، تشبیہوں اور استعاروں وغیرہ کے ذریعے نثر اور نظم میں اپنے علم کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن وہ ثبوت کہیں نہیں دیتا کہ فرمانرواؤں کے کارناموں میں خود شریک رہا تھا یا انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، سوائے اس تعریف کے جو مصنف اپنے دیوتا صفت انسانوں پر نچھاور کرتا ہے کسی بات سے یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ ان واقعات کے زمانے میں خود موجود تھا جنھیں وہ بیان کرتا ہے، اور چند تاریخوں کے بارے میں جو گنجلک اور بے ربطی ہے۔ نیز ان کی ساری تفصیلات غائب ہیں۔[۴]

طبقات ناصری

عہد وسطی کے تاریخی لٹریچر میں ایک اہم کتاب طبقات ناصری بھی ہے۔منہاج الدین بن سراج الدین پیدائش اور شادی دونوں کے اعتبار ی طبقہ امرا سے تعلق رکھتا تھا۔اس کے آباواجداد بڑے ممتاز لوگ تھے۔اس کے سگر دادا امام عبدالخالق من جان (جز جان مرد اور بلخ کے درمیان واقع ہے) کی شادی غزنہ کے سلطان ابراہیم کی بیٹی سے ہوئی تھی۔اس کے والد محمد غوری کی کمان میں ہندوستان آنے والی فوج کا قاضی تھا۔(۱۱۸۶) منہاج خود بڑا عالم تھا اسے اچ کے فیروزی مدرسے کا نگراں (۱۲۲۷ء) افسر قانون نیز مذہبی، اخلاقی اور قانونی امور کی تبلیغ کا ناظم (۱۲۳۲ء) دہلی کا قاضی (۱۲۴۱ء) دہلی کے ناصریہ مدرسے کا نگراں اور اس کی جائیداد واملاک کا منتظم، گوالیار کا قاضی، ام البلاد کی مسجد میں مبلغ (۴۵-۱۲۴۴ء) صدر جہاں، ناصرالدین کے تخت سلطنت کا قاضی اور دارالسلطنت کا حاکم فوجداری (۱۲۴۶ء) مقرر کیا گیا تھا۔ بنگال کے صدر مقام لکھنوتی میں تقریباً تین سال ۴۲-۱۲۴۱ء تا ۴۴-۱۲۴۳ء) قیام کے باعث اسے مسلمانوں کے دور دراز کے علاقوں کے بارے میں درست معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔

ان سب باتوں نے اس کی کتاب (طبقات ناصری) پر جو بڑی فاضلانہ اور مداحانہ تصنیف ہے، اثر ڈالا ہے۔اس نے اپنے سرپرست ناصرالدین کی تعظیم میں اپنی کتاب کا نام اس کے نام پر رکھا اور تحریر کرتے وقت بڑا مداحانہ انداز اختیار کیا۔اس میں ناصرالدین کے دور کے جاری رہنے کے واسطے بعض بے ساختہ قسم کی دعائیں ہیں۔اس کے باوجود لائق نقادوں کا خیال ہے کہ وہ شاذ ونادر ہی مبالغہ آمیز تعریف وتوصیف کرتا ہے اور سیدھے سچے انداز میں حقائق بیان کر دیتا ہے جس سے اس کے بیانات کی سچائی اور اس کے علم کی درستی پر اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ [۵]

تاریخ فیروز شاہی

ہندستان کی تاریخ تصنیف کرنے والے پہلے مسلمان، ضیا الدین برنی (پیدائش ۱۲۸۵ء) کے تعلقات دہلی کے حکمراں طبقوں میں خوب تھے۔چونکہ دربار تک اس کی رسائی آسان تھی، اس لیے صحیح تفصیلات جاننے کا اسے خوب موقعہ تھا۔محمد بن تغلق کا رہین منت ہونے کی وجہ سے اس نے تغلق کی

زندگی میں اس پر تنقید نہ کی۔ جب اسے دربار سے نکال دیا گیا تو اس نے احساس ظلم اور یاس کے تحت لکھنا شروع کیا۔ اگر فیروز اسے نہ بچاتا تو جیسا وہ خود کہتا ہے، وہ مادر گیتی کی آغوش میں سو گیا ہوتا۔ چونکہ وہ باطنی طبیعت کا شخص تھا اس لیے اس کا خمیر کچوکے سے لگاتا تھا۔ اور وہ اپنی بدبختی کو اپنی اخلاقی ناکامی سے منسوب کرتا تھا۔ اس لیے اس کی کتاب کا ایک عملی مقصد تھا: کتاب دوہری نذر ثابت ہو سکے، خدا کی نذر، تاکہ اس کے گناہ معاف ہو جائیں اور ان کا ازالہ ہو جائے، سلطان کی نذر، تاکہ اس کی سرپرستی حاصل ہو جائے اور تنگ دستی سے چھٹکارا مل جائے نیز دشمنوں کی افترا پردازی سے محفوظ ہو جائے۔ لہٰذا اس کا نام فیروز شاہ کے نام پر (تاریخ فیروز شاہی) رکھا گیا۔

برنی دراصل ایک عالمی تاریخ رکھنا چاہتا تھا جو آدم سے شروع ہوتی لیکن بعد میں اس نے ارادہ بدل دیا۔ تاریخ فیروز شاہی (جو ۱۳۵۸ء میں لکھی گئی) میں وہ اس دور کے کل آٹھ بادشاہوں کا تذکرہ کرتا ہے، جو بلبن سے فیروز شاہ کے پہلے چھ برسوں تک کا دور ہے، اور یہ تذکرہ تقریباً اس جگہ سے شروع ہوتا ہے جہاں منہاج نے اپنی تاریخ ختم کی تھی۔ [۶]

تزک بابری

ظہیر الدین محمد بابر ایک اچھا بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا قلم کار بھی تھا، اس کی خود نوشت سوانح عمری محض ایک سیاسی تحریر ہی نہیں، بلکہ ایک ماہر حیوانیات و نباتات کا رسالہ بھی ہے۔ اپنے تجربوں اور جوہروں کی بنا پر اس میں اپنی توزک جیسی بیش بہا کتاب لکھنے کی لیاقت بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ ایک عظیم سپہ سالار اور جید سیاستداں تھا۔ گو وہ ایک سپاہی تھا جو قسمت آزمانے کے لیے ہر دم تیار رہتا تھا، پھر بھی تعلیم یافتہ اور ماہر شخص تھا۔ وہ عربی، فارسی (تہذیب کی زبان کا ایک ممتاز عالم تھا۔ اور اپنی مادری زبان ترکی کا صاحب طرز استاد نثر تھا۔ وہ ایک نفیس شاعر بھی تھا، وہ ایک ایسا باریک بین اور نازک مذاق نقاد تھا جس کی زبان میں ساری لطافت اور نفاست موجود تھی۔ وہ جس علاقے میں گیا وہاں چیزوں کو گنتی کے اعتبار سے بڑے پر تجسس انداز میں ٹھیک طور سے دیکھا وہ خوبصورت نظاروں اور عمدہ پھولوں کا بڑا شیدائی تھا۔ اسے "حسن فطرت سے بڑا پیار تھا، اس کی آنکھ حسن کو ہر شکل میں دیکھ لیتی تھی، اور وہ ایک سائنس داں کی طرح گہرا مشاہدہ کرتا تھا۔ [۷]

تزک جہانگیری

نورالدین محمد سلیم جہانگیر کی خودنوشت سوانح عمری پر نہ صرف اس کے کردار علم وفضل اور اس کی زندگی کے نشیب وفراز کی چھاپ پڑی ہوئی ہے، بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی معمولی لیاقت کا آدمی نہیں تھا۔ وہ اپنی کمزوریاں تحریر کرتا ہے، بڑی صاف دلی سے غلطیوں کا اعتراف کرتا ہے، اور اگر محض اس کی کتاب پڑھ لی جائے تو اس کی صلاحیتوں اور دونوں کی بابت بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی جواہرات کا شائق تھا، اور ایک بجے نقاد کی طرح ان کی قیمت کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ وہ ایک زبردست شکاری تھا اور اپنی زندگی کے آخری برسوں تک اسے اس کھیل میں مزہ ملتا رہا۔ وہ فطرت کا شیدائی تھا، خواہ وہ جاندار کی شکل میں ہو یا بے جان شکل میں، اور اسے ہی تیز اور مشتاق نظروں سے دیکھتا تھا۔ وہ بہت سے جانوروں اور پرندوں کی خصوصیات کا ذکر کرتا ہے، اور تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑی سرگرمی اور مستقل مزاجی سے ان کی عادتوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ درخت، پھل اور پھول بھی اس کے مشاہدے میں رہے، اور وہ اس انداز سے فن تعمیر اور باغبانی پر رائے زنی کرتا جیسے اس نے ان چیزوں پر بڑا وقت صرف کیا ہو اور غور کیا ہو۔ جہانگیر کی توزک بابر کی توزک سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ اگر بابر ہمیں اپنی عیاشی کی خلوتوں میں شامل کر لیتا ہے تو جہانگیر بھی بڑے پرسکون انداز میں ہمیں یہ بتا دیتا ہے کہ اس نے ابوالفضل کو کس طرح قتل کروایا لیکن وہ نور جہاں سے اپنی شادی کا ذکر نہیں کرتا۔ [۸]

ہمایوں نامہ

گل بدن بیگم، بابر کی بڑی تعلیم یافتہ بیٹی (۱۵۲۳ء تا ۱۶۰۳ء) اور ایک چغتائی مغل خواجہ خضر خاں کی بیٹی تھی۔ اس نے اکبر کی درخواست پر ہمایوں نامہ لکھا تھا۔ (سترہ سال کی عمر میں)، وہ جب آٹھ برس کی تھی تو بابر فوت ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے اس کا بہت مختصر طور پر ذکر کیا ہے، اور یہ ذکر ان رودادوں کی بنیاد پر کیا ہے جو اسے دوسروں سے وصول ہوئی تھیں۔ ہمایوں نے ۱۵۳۰ء کے بعد اس سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ ۱۵۴۰ء کے بعد اس نے کابل میں قیام کر لیا۔ ہمایوں کی فتوحات، شکستوں، دشواریوں اور مصائب (جو اسے بے وفا کامران کے ہاتھوں اُٹھانے پڑے) کی وہ تقریباً عینی شاہد تھی۔ جہاں وہ ذاتی مشاہدہ پورے طور سے نہ کر سکی وہاں اُسے دوسروں، خصوصاً حرم کی بزرگ خواتین پر بھروسہ کرنا پڑا جیسے

خانزادہ، ماہم اور حمیدہ بانو بیگم پر جن کی وہ عزت کرتی تھی اور جن کا اعتماد اسے حاصل تھا۔ یہ کتاب فطری طور پر مغلوں کے سماجی اور تہذیبی پہلو پر زیادہ روشنی ڈالتی ہے اور فوجی تفصیلات (جیسے چوسہ اور فتوح) پر کم بعض اوقات واقعات کی ترتیب غلط ہو جاتی ہے۔ [۹]

اکبر نامہ و آئینِ اکبری

ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر کا وزیر اور دوست، مصنف، سیاسی مدبر، سفارت کار اور فوجی کمان دار شیخ ابوالفضل (۱۵۵۱ء) تا ۱۶۰۲ء) حجاز کے ایک عربی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، جو ہجرت کر کے سندھ آ گیا تھا اور پھر اجمیر کے شمال مغرب ناگور میں مقیم ہو گیا تھا۔ اسے تصوف، علم اور وسیع المشربی کی روایتیں اپنے والد مبارک اور اپنے دادا خضر سے ورثے میں ملی تھیں، اور برداشت کا سبق اس نے مدرسہ جبر و مصائب میں سیکھا تھا، کیونکہ مہدوی رجحانات کی وجہ سے اس کے والد مبارک کو مصائب اُٹھانے پڑے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں مختلف علوم پر قدرت حاصل کر کے اور عمر سے پہلے ہی خود استاد بن کر اس نے اپنی قبل از وقت غیر معمولی ذہنی نشو و نما اور وسعتِ علم ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ رشتے داروں کی ملامتوں کے باعث اسے زاہد علمی کی خلوت کو خیر آباد کہنا پڑا۔ ۱۵۷۳ء میں وہ اپنے بڑے بھائی فیضی کے ذریعے شہنشاہ سے متعارف ہوا، اور چونکہ علم و فضل نیز مخلصانہ وفاداری کے باعث اسے تیزی سے ترقی ملی، اس لیے حریفوں اور دشمنوں کو جلن پیدا ہونے لگی۔ اس کا رتبہ، انتظامی تربیت، ہر معاملے سے ذاتی تعلق، سرکاری کاغذات تک رسائی، علم و فضل اور حیرت خیز ادبی اسلوب، ان سب باتوں نے مل کر اس کی دونوں کتابوں کو انمول کتابیں بنا دیا ہے۔ ابوالفضل ہمیں تاریخ کی اپنی تجربہ گاہ میں لے جاتا ہے اور اکبر نامہ نیز آئینِ اکبری میں استعمال کیے جانے والے اپنے طریقوں کی وضاحت کرتا ہے۔ [۱۰]

منتخب التواریخ

منتخب التواریخ عہدِ وسطی کی اہم تاریخی دستاویز شمار کی جاتی ہے۔ ''منتخب التواریخ'' کا لغوی مطلب ہے چنیدہ تاریخ، لیکن مصنف کے اندازِ بیان کی بنا پر بعض ماہرین اسے ایسی تاریخ جو انتظام کے ساتھ لکھی گئی ہو (History written with A Vengeance) بھی کہتے ہیں۔ [۱۱] یہ واحد کتاب ہے جو اکبر کے دور میں لکھی گئی، لیکن اکبر کے لیے نہیں لکھی گئی تھی۔ [۱۲] یہ کتاب تین جلدوں پر

مشتمل ہے اور ہر جلد میں مختلف موضوعات اور انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ کتاب میں ۱۵۹۵ء تک کی تاریخ کو قلمبند کیا گیا ہے۔[۱۳]

ملاعبدالقادر بدایونی کو اکبر کے دور کی بدعات اور خرافات سے شدید نفرت تھی، مگر وہ کھلے عام صرف محدود احتجاج کر سکتے تھے۔ یہی عوامل انہیں مجبور کرتے تھے کہ وہ اپنی کتاب خفیہ طور پر تحریر کریں۔[۱۴] اپنی تحریر کا مقصد بیان کرتے ہوئے بدایونی لکھتے ہیں:

''میں ان حالات کو قلمبند نہ کرتا، لیکن خدائے برتر گواہ ہے کہ دین کے درد اور ملت مرحومہ اسلام کی دلسوزی میں میرا قلم رک نہ سکا اور یہ باتیں زبان قلم پر آ گئیں۔ اس میں نہ تو مقصود کسی قسم کا طعن وطنز کرنا ہے نہ اس کے پیچھے حسد وتعصب کا کوئی جذبہ کام کر رہا ہے۔''[۱۵]

مزید یہ کہ، وہ اپنی کتاب کے سبب تالیف کے بارے میں کہتے ہیں:

''اس مجموعہ کا نام میں نے 'منتخب التواریخ' رکھا جس کا مقصد وحید یہ ہے کہ بادشاہان اسلام کے فرخندہ فرجام ناموں کو باقی رکھا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس مؤلف کی یادگار بھی اس سرائے مستعار میں رہ جائے۔ امید ہے کہ یہ ناتمام تالیف آخرت میں میری مغفرت کا موجب ہوگی نہ باعث اضافہ گناہ۔[۱۶]

بدایونی نے اسلام کے ماضی کا جائزہ لیا، خاص طور پر جب سے یہ ہندوستان میں ظاہر ہوا اور کبھی ختم نہ ہوا، یہاں تک کہ اکبر کے دور اقتدار اور مصنف کے زمانے تک۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ اپنی کتاب کا آغاز سندھ کی مسلم فتح سے نہیں کرتے۔ ان کے مطابق: ''محمد بن قاسم کی وفات کے بعد اس خطے میں اسلام کو مستحکم نہیں کیا جا سکا۔''

دوسری جانب، بدایونی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اپنی تاریخ کا آغاز ناصرالدین سبکتگین سے کرنا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ: ''ناصرالدین سبکتگین، جن کا بیٹا سلطان محمود غزنوی تھا، نے ہندوستان میں مقدس جنگوں کی نیت سے سالانہ مہمات کی قیادت کی، اور لاہور ان کی اولاد کے دور حکومت میں دارالحکومت بن گیا۔ مزید یہ کہ اسلام اس کے بعد کبھی اس زمین سے ختم نہیں ہوا۔''[۱۷]

یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ منتخب التواریخ کی پہلی جلد، جو سبکتگین سے ہمایوں تک کی تاریخ پر مشتمل ہے، کو اس انداز میں مرتب کیا جاتا کہ یہ ہندوستان میں اسلام کی عظمت کی نمائندگی کرتی، خاص طور پر اس پس منظر میں کہ اکبر کے دور میں شعوری طور پر اس عظمت کو مٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ موضوع دوسری

جلد میں زیر بحث آیا ہے۔تاہم، بدایونی نے ایسا نہیں کیا۔پہلی جلد میں انہوں نے رسمی انداز اپنایا ہے اور زیادہ تر سلاطین کی تخت نشینی، جنگوں، بغاوتوں، اور مہمات کا ذکر کیا ہے۔ان موضوعات پر بھی کوئی مکمل یا مربوط بیانیہ پیش نہیں کیا گیا۔اگر بدایونی کے نزدیک اسلام کی عظمت کا مظہر صرف یہی عوامل ہوتے ،تو اکبر کے دور میں بھی ان کی کئی مثالیں موجود تھیں۔لہذا، جو عنصر اکبر کے دور سے پہلے کے ادوار کو خود اکبر کے دور سے ممتاز کرتا، بدایونی نے اس پہلو کو اپنی تاریخ میں واضح طور پر پیش نہیں کیا۔ [۱۸]

ملا عبدالقادر بدایونی اپنی کتاب منتخب التواریخ میں ہر دور حکومت کا جامع احاطہ نہیں کرتے۔ وہ ہر دور سے متعلق تمام معلوم واقعات کا ذکر کرنے کے بجائے منتخب واقعات پر توجہ دیتے ہیں۔بعض اوقات وہ طویل ادوار حکومت کو صرف چند جملوں میں سمیٹ دیتے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے واقعات کا انتخاب پہلی جلد کے بجائے دوسری جلد میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے، کیونکہ یہ کتاب معاصر حالات کے ردعمل کے طور پر لکھی گئی تھی۔ بدایونی کا نقطہ نظر زیادہ تر منفی تھا؛ وہ اکبر کی بدعتوں کی مذمت کرتے ہیں لیکن کوئی متبادل یا ماضی کی طرف واپسی کی تجویز پیش نہیں کرتے۔یہی منفی نقطہ نظر انہیں اکبر کے دور کو ایک تاریخی تناظر میں پیش کرنے سے قاصر رکھتا ہے۔اس کے نتیجے میں، منتخب التواریخ کی پہلی جلد میں واقعات کا انتخاب بے ترتیب اور غیر منظم محسوس ہوتا ہے۔یہ نہ تو اکبر کے دور کے لیے کوئی تاریخی پس منظر فراہم کرتی ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی واضح تقابل پیش کرتی ہے۔

بدایونی عموماً تاریخی ترتیب کی پیروی کرتے ہیں، لیکن بعض اوقات وہ اس اصول سے انحراف بھی کرتے ہیں۔مثلاً، علاؤالدین خلجی کے دور میں، تمام مغل حملوں کا ذکر ایک ہی جگہ کرتے ہیں، لیکن فوراً بعد درمیانی واقعات کی طرف لوٹ آتے ہیں۔اسی طرح محمد تغلق کے دور میں، گورشاسپ کی بغاوت کا ذکر دارالحکومت کی منتقلی کے بعد کرتے ہیں، حالانکہ یہ واقعہ پہلے پیش آیا تھا۔عام طور پر، وہ ایک باب کا آغاز کسی حکمران کی تخت نشینی سے کرتے ہیں اور اختتام اس کی معزولی یا وفات پر۔حکمرانی کی مدت کا ذکر بھی آخر میں کرتے ہیں۔ابتدائی زندگی کا ذکر شاذ و نادر ہی ملتا ہے، جیسے التمش اور شیر شاہ کے معاملات میں۔

بدایونی کے بیان میں حکمرانوں کے ادوار کی تفصیل میں بڑی غیر یکنواختی (Uniformity) پائی جاتی ہے۔بلبن کے دور کو صرف پانچ صفحات دیے گئے ہیں، جبکہ کیقباد کے دور کو آٹھ صفحات سے زائد، بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد اور مرثیوں پر ان سے بھی زیادہ صفحات دیے گئے ہیں۔علاؤالدین خلجی کے

معاشی اور انتظامی اصلاحات کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن تفصیلات کے لیے قارئین کو برنی کی تاریخ فیروز شاہی کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ شیر شاہ کی اصلاحات کا مکمل طور پر نظر انداز کرنا حیران کن ہے، حالانکہ وہ ان کی بے حد تعریف بھی کرتے ہیں۔

منتخب التواریخ کی دوسری جلد اپنی شکل، مواد اور انداز بیان میں پہلی جلد سے واضح طور پر مختلف ہے۔ اس جلد میں اکبر کے پہلے ۴۰ سال کے دورِ حکومت کو سال بہ سال ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اکبر کی فتوحات، انتظامی اقدامات، اور مذہبی تجربات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ واقعات کو ان کے وقوع پذیر ہونے والے سال کے تحت تقسیم کیا گیا ہے، جیسے اکبر کی گجرات کی مہمات کو الگ الگ سالوں میں پیش کیا گیا۔ اس جلد میں اکبر کی مذہبی بدعات، جیسے اذان و نماز پر پابندی، داڑھی ترشوانے پر زور، دین الٰہی کا اجرا، اور گائے کے ذبیحے کی ممانعت کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اکبر کے معاونین کو لعن طعن کرنے کے ساتھ، بدایونی نے اکبر کی مذہبی پالیسیوں کو اسلامی تعلیمات کے خلاف قرار دیا ہے۔

بدایونی نے اکبر کی نظریاتی بنیادوں پر تنقید کی ہے، لیکن سیاسی معاملات میں وہ اکبر کے حامی دکھائی دیتے ہیں۔ جب تک مذہب اور سیاست الگ رہے، بدایونی نے اکبر کی عزت کی، لیکن جیسے ہی اکبر نے مذہبی امور میں مداخلت شروع کی، بدایونی نے اس کے خلاف قلم اٹھا لیا۔ اپنے مخصوص اور متعصّبانہ خیالات کے باوجود، منتخب التواریخ ایک منفرد کشش رکھتی ہے۔ یہ کتاب اکبر کے دور کی سچی دستاویز تو نہیں بن سکی، لیکن اس میں مذہبی اور سیاسی تحریکات کے حوالے سے کئی دلچسپ پہلو موجود ہیں۔[19]

منتخب التواریخ کی تیسری جلد عہد اکبری کے علماء، صوفیاء، حکماء، اور ادباء کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس جلد میں تقریباً ۲۳ مشائخ کا ذکر کیا ہے، جن میں شیخ نظام نار نولی، شیخ اللہ دیہ خیر آبادی، شیخ داؤد جہنی وال، اور شیخ ادھن جونپوری نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ، انہوں نے ۴۸ علماء کے حالات قلمبند کیے ہیں، جن میں میاں حاتم سنبھلی، مولانا عبداللہ سلطان پوری، شیخ مبارک ناگوری، شیخ عبدالنبی صدر الصدور، اور قاضی جلال الدین ملتانی شامل ہیں۔

اسی طرح، بدایونی نے ۸ حکماء کا ذکر کیا ہے، جن میں حکیم الملک گیلانی، حکیم سیف الملوک دماوندی، حکیم مسیح الملک شیرازی، اور حکیم مصری قابل ذکر ہیں۔ ادباء اور شعراء کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا گیا ہے، جن کی تعداد تقریباً ۹۰ ہے۔ ان میں غزالی مشہدی، قاسم کاہی، شاہ ابوالمعالی، عرفی شیرازی،

ملک الشعراء شیخ فیضی، نامی، اور مدامی بدخشی شامل ہیں۔

بدایونی نے اس جلد کے ذریعے ان شخصیات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جنہیں وہ اچھے علماء وفضلاء سمجھتے تھے۔ وہ نظام الدین احمد، مؤلف تاریخ نظامی کی اس کتاب میں مذکور شاہی دربار سے وابستہ امراء کو گمراہ اور بدعمل تصور کرتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے صالح اور نیک شخصیات کا تذکرہ کرنے کے لیے تیسری جلد لکھنے کا عزم کیا۔ انہوں نے اپنے احساسات کو ان الفاظ میں بیان کیا:

من وفائی ندیدم ز کسان
گر تو دیدی دعائی من برسان

میں نے کسی سے بھی کوئی وفا نہیں دیکھی اگر تو نے کوئی وفا دیکھی ہو تو میری دعا ان تک پہنچا دے۔

ان امراء کی گمراہیوں کی وجہ سے میں نے اپنے قلم کو ان کے فضول تذکروں میں الجھنے نہیں دیا، بلکہ یہ صفحات اس عہد کے بعض مشائخ کے تذکرے سے شروع ہوتے ہیں۔ دور اکبری کے بزرگوں میں سے اکثر رحلت فرما چکے ہیں۔ ان میں سے جو مشہور شخصیتیں ہیں ان کے حالات تحریر کیے جاتے ہیں۔[۲۰]

منتخب التواریخ کی تیسری جلد ملا عبدالقادر بدایونی کے نظریاتی رجحانات اور ان کے دور کے علمی و ادبی ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ بدایونی نے اس جلد میں علماء وفضلاء کے اوصاف، ان کی علمی و عملی خدمات، اور حسن سلوک کو خصوصی طور پر اجاگر کیا ہے۔ وہ اکثر شعرا کے اشعار نقل کرتے ہیں اور ان کی زندگی و فن پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ امیر خسرو اور امیر حسن کو اس جلد میں نمایاں مقام دیا گیا ہے، جو ان کے ادبی اور فکری قد و قامت کو ظاہر کرتا ہے۔

خلیق احمد نظامی نے اکبر کے دور کی تاریخی ادبیات پر اپنے مطالعے میں منتخب التواریخ کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اگرچہ بدایونی کے ہم عصر مؤرخین اور جدید محققین ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہیں، لیکن ان کی کتاب اکبر کی مذہبی ہم آہنگی کی کوششوں کو ناکام بنانے والے عوامل کے تجزیے میں بے پناہ تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ نظامی کے مطابق، بدایونی کا کام ابوالفضل کے بیانیے میں پائے جانے والے خلا کو پُر کرتا ہے۔ جہاں ابوالفضل کے متن میں بعض اہم واقعات کی معلومات محدود یا غیر واضح ہیں، وہاں بدایونی کی تحریریں ان کی تفصیل فراہم کرتی ہیں۔

اس لحاظ سے، بدایونی کا کام ابوالفضل کی تحریروں کے لیے ایک تکملہ اور معاون کا کردار ادا کرتا ہے۔ [۲۱]

حواشی

۱۔ قاضی محمد اسماعیل ابن علی چچ نامہ-آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا ur.wikipedia.org
۲۔ قاضی محمد اسماعیل ابن علی، چچ نامہ (تصحیح بلوچ نبی بخش خان مترجم اختر رضوی، فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ) سندھی ادبی بورڈ کتاب گھر، تلک چاڑھی، حیدرآباد سندھ، جام شورو، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۷
۳۔ محبّ الحسن (مترجم مسرور ہاشمی) ہندوستانی دور وسطی کی مؤرخین، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص: ۸۴-۲۸۲
۴۔ ایضاً، ص: ۸۹-۲۸۸
۵۔ ایضاً، ص: ۹۰-۲۸۹
۶۔ ایضاً، ص: ۹۳-۲۹۲
۷۔ ایضاً، ص: ۶-۳۰۵
۸۔ ایضاً، ص: ۷-۳۰۶
۹۔ ایضاً، ص: ۱۳-۳۱۲
11. Mukhia, Harbans, Historian and Historiography During the Reign of Akbar, Vikas Publishing House Pvt. Ltd, New Delhi, 1976 P: 111.
12. Nizami, Khaliq Ahmad, On History and Historians of Medieval India, Munshiram Manoharlal Publishers Pvt. Ltd, New Delhi, 1983, P: 240.
13. Sengupta, Dr. Chandni, Badauni as a Source for Interpreting the History of Akbar's Period: A Critical Review
of the Muntakhab-ut-Tawarikh and Najat-ur-Rashid, IJRESS, Vol: 6, Issue: 3, March 2016, P: 55.
14. Ibid, P: 52.
۱۵۔ بدایونی، ملاعبدالقادر، منتخب التواری (مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، جلد دوم وسوم، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۱۲-۲۱۱
۱۶۔ حوالہ سابق، منتخب التواریخ، ج: اول، ص: ۹
۱۷۔ ایضاً، ص: ۸
18. Mukhia, Harbans, Historian and Historiography During the Reign of Akbar, Vikas Publishing House Pvt. Ltd, New Delhi, 1976 P: 111-112.
19. Badauni as a Source for Interpreting the History of Akbar's Period: A Critical Review of the Muntakhab-ut-Tawarikh and Najat-ur-Rashid, P: 53.
۲۰۔ حوالہ سابق، منتخب التواریخ ر ج دوم وسوم، ص: ۳۶۶
21. On History and Historians of Medieval India, P: 240.

ڈاکٹر انیس الرحمن قاسمی *

مدارسِ ہند کا نصابِ تعلیم
ایک تاریخی جائزہ

پوری دنیا میں مسلمانوں کو جب سیاسی عروج حاصل ہوا تو انھوں نے نہ صرف مذہبی علوم کو بلکہ غیر مذہبی دیگر علوم کو بھی ترقی دی۔ مکہ، مدینہ، بغداد، بصرہ، کوفہ، دمشق، غرناطہ، قرطبہ، قاہرہ، قسطنطنیہ، رے، اصفہان، شیراز، تبریز، نیشاپور، بخارا، سمرقند، ہرات، نساء، ترمذ وغیرہ میں واقع علوم کے مراکز سے فارغ التحصیل علماء اور دانشوروں کو نورِ علم کا علمبردار قرار دیا گیا۔

جب اسلام دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں پھیل گیا تو ہر جگہ مسجدیں تعمیر ہوگئیں اور اس زمانے میں علمی مراکز یہی مسجدیں تھیں۔ تعلیمی نصاب میں مطالعۂ قرآن پاک، فقہ، حدیث، تفسیر کے علاوہ دنیوی علوم میں تاریخ، ادب، خوشخطی، فلسفہ، علم کیمیا، فن تعمیر، فن نقاشی، خطابت، کتابت وغیرہ شامل تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مساجد کی چہار دیواری سے بڑے بڑے علماء، فقہاء، ادباء، دانشور، اطباء وحکماء پیدا ہوئے، کیونکہ مسجد بیک وقت عبادت گاہ بھی تھی، تربیت گاہ بھی اور اچھے انسان ڈھالنے کی کارگاہ اور علم وعمل کی شاہراہ بھی تھی۔

* اسسٹنٹ پروفیسر (C) شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵ anisurrahman1@jmi.ac.in

مرور زمانہ کے ساتھ مسلم حکمرانوں نے مختلف شہروں میں یونیورسٹیاں قائم کیں۔سب سے پہلے مسلمانوں نے باضابطہ اسپین میں تعلیمی ادارے قائم کیے۔بعض مؤرخین سلجوقیوں کے عہد سے مدارس کے قیام کو شمار کرتے ہیں جو کہ غلط ہے، کیونکہ سلجوقیوں کا اصل دور ۱۰۳۷ء سے شروع ہوتا ہے اور جامعہ قرطبہ کو عبدالرحمٰن اول نے ۷۸۶ء میں قائم کیا۔اس کے بعد فاطمی خلیفہ معزالدین نے قاہرہ (مصر) میں جامع ازہر کو ۹۷۲ء میں قائم کیا جہاں کے فارغ طلبا نے دینیات، فلسفہ ومنطق، فلکیات اور فن خطاطی وغیرہ میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔واضح ہو کہ مصر میں فاطمیوں کی حکومت ۹۶۹ء میں شروع ہوئی۔اسی طرح مراکش کے شہر فاس میں واقع جامعہ قروبین جسے فاطمہ الفہری[۱] نے ۸۵۹ء میں قائم کیا تھا، جامعہ ازہر کی طرح قدیم ترین یونیورسٹی ہے جو آج تک علم کی دولت سے دنیا کو مالا مال کر رہی ہے۔

اس کی توضیح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ مدرسہ کا وجود اسلام میں سب سے پہلے اہل نیشاپور (ایران) کے ہاں عمل میں آیا، جہاں نیشاپور کے علماء نے مدرسہ بیہقیہ کی بنیاد رکھی تھی۔اسی طرح تاریخ فرشتہ میں ہے کہ ۴۱۰ھ/ ۱۵۱۹ء میں سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایۂ تخت غزنی میں ایک جامع مسجد عروس الفلک کے نام سے تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ ایک عظیم الشان مدرسہ بھی تعمیر کرایا تھا۔مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ بھی تھا، جو نادرالوجود کتابوں سے ساتھ معمور تھا۔مسجد و مدرسہ کے اخراجات کے لیے سلطان نے بہت سے دیہات کی آمدنی وقف کی تھی۔[۲] ان مدارس کے قیام کے کچھ عرصہ بعد دولت سلجوقیہ کے علم دوست وزیر نظام الملک طوسی[۳] (م: ۴۸۵ھ/۱۵۹۲ء) نے نیشاپور اور بغداد میں دو دارالعلوم قائم کیے جن کو تاریخ کے اوراق میں ''نظامیہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس دارالعلوم کے لیے جو بغداد میں ۴۵۹ھ/ ۱۵۶۷ میں قائم ہوا تھا۔ چھ لاکھ دینار کی گراں قدر رقم شاہی خزانے سے مقرر تھی اور نظام الملک نے خود اپنی جاگیر کا دسواں حصہ اس کے لیے وقف کر دیا تھا۔طلباء کے لیے وظائف کا انتظام کیا گیا اور اساتذہ کے لیے بیش قرار مشاہرے مقرر کیے گئے۔نظام الملک نے نہ صرف نیشاپور اور بغداد میں ہی دارالعلوم قائم کیے، بلکہ اس نے حکم سے ملک میں جس جگہ بھی کوئی ممتاز عالم موجود ہوں وہاں ایک مدرسہ اور اس کے ساتھ ایک کتب خانہ تعمیر کیا گیا، چناں چہ اس زمانے میں ہزاروں مدارس اور کتب خانے قائم ہوئے۔امام الحرمین (امام غزالی کے استاد) نے مدرسہ بیہقی میں تعلیم پائی تھی۔ جب نظامیہ قائم ہوا تو امام الحرمین کو اس کا صدر بنا دیا گیا۔امام غزالی جیسے

یکتائے زمانہ نظامیہ کے خوشہ چینیوں میں ہیں۔نظامیہ کے علاوہ بغداد میں تیس اور بڑے دارالعلوم قائم تھے۔

ان اداروں پر ہونے والے اخراجات کا انتظام جائدادوں کو وقف کر کے کیا گیا۔ان وقف شدہ جائیدادوں سے حاصل ہونے والی آمدنی سے اساتذہ کی تنخواہ، طالب علموں کی قیام وطعام اور دیگر ضروری اخراجات انجام پاتے تھے۔

سلجوقیوں کے عہد میں نظام الملک طوسی نے جو مدارس قائم کئے تھے وہ تمام سنی مسلک کے علم بردار تھے، بعد کے ادوار میں عالم اسلام میں اور خاص طور پر عراق وایران اور وسط ایشیاء میں جو مدارس قائم ہوئے وہ اسی نظامیہ مدرسوں کے نہج پر تھے۔ان مدارس میں تھوڑا سا فرق یہ تھا کہ کہیں کہیں نصاب میں تبدیلی کی گئی تھی یا نصاب کے فنون تو یکساں تھے لیکن کتابیں بدل دی گئیں تھیں۔

ہندوستان میں تعلیم

تیرہویں صدی کے ابتداء ہی میں عرب، ایرانی اور ترکی ثقافتیں ہندوستان وارد ہوئیں۔ ترک حکمرانوں کے ساتھ علماء ودانشوران اپنے علوم وفنون کی کتابیں اور علمی مباحث کے ساتھ برصغیر پہنچے۔دوسری طرف مسلم تہذیب وثقافت منگولوں کے ذریعہ تباہ وبرباد ہو گئے تو ہندوستان ہی وہ سرزمین تھی جس نے اس عجمی تہذیب وثقافت کو نہ صرف محفوظ کرلیا بلکہ اسے ترقی کے اعلی مدارج تک پہنچادیا۔

برصغیر میں سندھ وملتان کے علاقے اسلامی علوم کے اولین گہوارے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ سب سے پہلے عربوں نے اسی علاقے کی تسخیر کی اور پھر وہاں سماج کے لیے مفید تر تمام پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی گئی۔پھر غزنوی سلطنت نے جب لاہور کو اپنے قبضہ میں لیا تو یہ شہر بھی علوم اسلامیہ کے مرکز کی حیثیت سے متعارف ہوا۔اس کے بعد تیرہویں صدی کے ابتداء میں جب ترکوں نے آگے بڑھ کر دہلی کو فتح کرلیا اور اسے دارالسلطنت بنالیا تو رفتہ رفتہ عراق، ایران اور وسط ایشیاء نیز دوسرے مما لک سے علماء، صلحاء اور مفکرین ودانشوران ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے اور دہلی واطراف کے شہروں میں آبسے اور اس طرح ہندوستان میں اسلامی تعلیم کی ترقی کا دور شروع ہوگیا۔ان ہی علماء، صلحاء، ہنرمندوں، امراء واعیان کی وجہ سے دہلی شہر عظمت وشہرت کے آسمان پر چھا گئی۔

چودہویں صدی کے اواخر تک ان میں سے بہت سے افراد ہندوستان کے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب میں پھیل گئے، جس کی وجہ سے سرزمین ہند میں ایسی عظیم الشان علمی وتہذیبی رونق دیکھنے میں آئی جس کی نظیر اس وقت کی اسلامی دنیا میں مفقود تھی۔ ایران اور وسط ایشیاء سے ہندوستان کی طرف آنے والے قافلوں میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ ان لوگوں نے یہاں آ کر اپنی استعداد، قابلیت و صلاحیت سے اس ملک کو علم وہنر سے مالا مال کر دیا۔

منگولوں نے وسط ایشیاء اور ایران کے علمی مراکز سمرقند، بخارا، نیشاپور، شیراز کو تاخت وتاراج کر دیا، بڑے بڑے علماء قتل کر دیے گئے، کتب خانوں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا اور مسلم ثقافت کو ملیا میٹ کر دیا گیا، لیکن ہندوستان منگولوں کے اس وحشت ناک حملوں سے محفوظ رہا اور وہی عجمی ثقافت یہاں پنپنا شروع ہوئی۔ منگول اسلامی علوم کے دشمن تھے لیکن علم طب، ریاضی اور علم نجوم سے انھیں کسی حد تک لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان علوم وفنون کے ماہرین کی انھوں نے سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی۔ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

> ''منگولوں نے خلیفۃ المسلمین، فقہاء، قضاۃ اور محدثین کو قتل کیا، فلاسفہ اور منجموں کی حفاظت کی اور مدرسوں، مسجدوں اور خانقاہوں کو ان کے سپرد کر دیا، اور یہی لوگ ان کے خصوصی مشیر بن گئے۔''[۴]

نصاب تعلیم

بارہویں صدی عیسوی کے نصف اول سے مشرقی دنیا میں معقولات کا دور شروع ہوا، منگولوں نے اور تیموری حکمرانوں نے اس کی خوب سرپرستی کی، ہلاکو کے مشیرِ خاص نصیرالدین طوسی کی بدولت اس فن کو فروغ حاصل ہوا اور رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا فن معقولات نے پورے مشرقی علاقے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ترکوں کی آمد کے بعد ہی معقولات بھی ہندوستان آ چکا تھا اور عہد تغلق تک اس فن کو کافی ترقی مل چکی تھی کیونکہ محمد بن تغلق معقولات کا ایک بڑا عالم تصور کیا جاتا تھا، لیکن معقولات کو ہندوستان میں سرکاری سرپرستی سکندر لودھی کے عہد میں حاصل ہوئی اور اسے باضابطہ نصاب میں شامل کیا گیا۔ اسی طرح عہد مغلیہ میں بھی معقولات کو اہمیت حاصل تھی۔

منگولوں کے ہلاکت خیز حملوں سے قبل جو نصاب تعلیم ایران اور وسط ایشیاء میں رائج تھا وہی نصاب ترکوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں رائج ہوا، مسلمانوں میں فقہ اور اصول فقہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔قرآن مجید چونکہ اسلامی علوم کا سرچشمہ ہے، اسی نظریہ کوملحوظ رکھتے ہوئے سب سے پہلے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دی جاتی۔قرآن کی تعلیم کے بعد عربی کی ابتدائی کتابیں اور ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی سکھائی جاتی تھی کیونکہ فارسی زبان حکمران، امراء ورؤساء کی مادری زبان تھی اور اسے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔

ہندوستان کے مدارس میں مختلف زبانوں میں تعلیم کا مختلف نصاب رائج رہا ہے۔عہد غزنوی میں علم تفسیر، ہلک حدیث اور علم فقہ ہندوستان پہونچا۔پانچویں صدی سے ساتویں صدی تک ہندوستان کے مدارس میں پڑھائی جانے والی کتابوں کا ثبوت اب تک دستیاب نہ ہوسکا۔آٹھویں صدی میں علماء کے سوانح سے بہت ہی مختصرا پتہ چلتا ہے کہ کون کون سی کتابیں رائج تھیں۔

مولانا جمال الدین اُچھی کی سندھ کے حوالہ سے مندرجہ ذیل تحریر پڑھنے کے بعد اندازہ لگانا آسان ہوجاتا ہے کہ اس وقت کون کون سی کتابیں داخل نصاب یا رائج الوقت تھیں۔

> ’’انھیں شہر (اچھ، سندھ) میں متعین کیا جہاں وہ درس وافادہ کے لیے مقیم ہوئے اور بڑی مخلوق کو فائدہ پہونچا، یہ ہمیشہ درس دینے میں مشغول رہے اور تمام علوم پڑھاتے تھے، ہدایہ، بزدوی، مشارق، مصابیح اور عوارف وغیرہ ان کے درس کی کتابیں تھیں۔‘‘[۵]

پھر آٹھویں صدی میں ہندوستان میں صحیح مسلم کا نسخہ آتا ہے، چنانچہ مولانا زین الدین دیوی کے حالات میں ہے:

> ’’یہ فقہ اور حدیث کے ماہر عالموں میں سے تھے، انھوں نے صحیح مسلم بن حجاج نیشاپوری، شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کی خدمت میں ہدیہ بھیجی اور ان سے شہر بہار میں ملاقات کی۔‘‘[۶]

علم حدیث پر پڑھائی جانے والی کتابوں کی وضاحت سید ریاست علی ندوی کی مندرجہ ذیل تحریر سے ہوتی ہے۔

''علم حدیث میں اگرچہ صحیح بخاری وصحیح مسلم کے نسخے آٹھویں صدی میں ہندوستان کے اہل علم کے پاس پہنچ چکے تھے،لیکن ان کے نسخے زیادہ شائع نہیں ہوئے تھے، مدرسوں میں عموماً مشکوٰۃ ومشارق ہی پڑھائی جاتی تھیں۔''[۷]

ہند میں ترکوں کی آمد کے بعد

ترکوں نے جب دہلی کو فتح کیا تو ایک طرف دربار سجایا گیا تو دوسری طرف علوم وفنون کی محفلیں سجائی گئیں۔مسلمان بادشاہوں نے علماء ودانشوران کی خوب حوصلہ افزائی کی جس کی بدولت اکناف عالم سے علماء سمٹ سمٹ کر دہلی میں اقامت گزیں ہوگئے اور یہاں سے انھوں نے آزادی کے ساتھ علمی امورانجام دیئے۔

عہد بلبن میں شمس الدین خوارزمی، شمس الدین قوشجی، برہان الدین بلخی، برہان الدین بزاز، نجم الدین دمشقی، کمال الدین زاہد، اورعہد تغلق میں مولانا خواصگی، قاضی عبدالمقتدر، شیخ احمد تھانیسری، معین الدین عمرانی۔عہد خلجی میں تقریباً چھیالیس بڑے بڑے علماء صرف سرزمین دہلی میں موجود تھے۔ مولانا فخر الدین ناقلہ، مولانا ظہیر الدین لنگ، مولانا نظام الدین کلاہی، قاضی شرف الدین سربائی، مولانا تاج الدین مقدم، مولانا نصیرالدین غنی، مولانا کریم الدین جوہروغیرہ ممتاز ترین علماء موجود تھے۔

عہد سکندر لودھی میں معقولات کی دو بڑی شخصیتیں: ایک دہلی میں شیخ عبداللہ اور دوسرے سنبھل میں عزیز اللہ درس وتدریس میں مشغول تھے۔اکبر کے عہد میں عضدالملک شاہ فتح اللہ شیرازی ایک جید عالم تصور کئے جاتے تھے۔درس نظامی کا نصاب جسے نظام الدین سہالوی نے ترتیب دیا ہے، اسی فتح اللہ شیرازی کے ترتیب شدہ نصاب سے کم وبیش ملتا جلتا ہے۔

ضیاءالحسن فاروقی لکھتے ہیں:

''مندرجہ ذیل علمی شجرے سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ فتح اللہ شیرازی نے اکبر کے عہد میں درس وتدریس اورعلم وفن کی زمین میں جو بیج بویا تھا وہ درس نظامی کی صورت میں کس طرح بارآور ہوا۔''[۸]

میر فتح اللہ شیرازی (م:۱۵۸۸ء)

مفتی عبدالسلام لاہوری (م:۱۶۲۷ء)

مفتی عبدالسلام دیوی (م:۱۶۳۷ء)

مولانا دانیال چوراسی

ملا قطب الدین سہالوی (م:۱۶۹۱ء)

ملا قطب الدین سہالوی کے دو مشہور شاگردوں مولانا قطب الدین شمس آبادی (م:۱۷۰۹ء) اورحافظ امان اللہ بنارسی (م:۱۷۲۰ء) سے ملا نظام الدین سہالوی (م:۱۷۴۸ء) نے استفادہ کیا تھا۔

ملا نظام الدین سہالوی کے ذریعہ ترتیب شدہ نصاب کو پورے ہندوستان نے قبول کیا اور اسے پڑھ کر بڑے بڑے باکمال اساتذہ پیدا ہوئے۔ملا حسن، بحر العلوم مولوی نعیم اللہ، مولوی عبدالحکیم، ملا مبین، مفتی ظہور اللہ، مولوی ولی اللہ اور مولوی عبدالحلیم اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔مولانا ابوالحسنات ندوی رقم طراز ہیں:

> ”اس خاندان (قطب الدین سہالوی) کے تلامذہ میں قطب الدین گوپا مئوی، امان اللہ بنارسی، قطب الدین شمس آبادی، محبّ اللہ بہاری، مولوی حمداللہ، مولوی فضل امام اور مولوی فضل حق وغیرہ نے ہندوستان کے مختلف گوشوں میں علوم وفنون کی ترقی کے لیے بڑی کوششیں کیں اور آج تک ان کے گذشتہ مساعی کے جو کچھ نتائج باقی ہیں ان سے ہر شخص ان کی عظمت کا تصور کرسکتا ہے۔“[9]

اکبر کے دور کے دوسرے بڑے پایہ کے عالم عبدالحق محدث دہلوی ہیں جن کی بدولت علم حدیث کا چرچا پورے شمالی ہندوستان میں ہوا۔انھوں نے اپنی پوری زندگی علم حدیث کی نشر واشاعت میں صرف کردی۔

عہد شاہجہاں اور اورنگ زیب میں علامہ میر زاہد علم وفن کے سرتاج تھے، یہی وہ بزرگ ہیں جن کے سلسلۂ تصوف میں قاضی مبارک اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مشہور خاندان بھی ہے اور ان ہی کی بدولت علم حدیث وتفسیر کو پورے ہندوستان میں عام ہونے کا موقع ملا۔

گجرات میں علامہ طاہر پٹنی، شیخ وجیہ الدین گجراتی اور ملا نورالدین جیسے با کمال اشخاص نے علم کا علم بلند کیا۔ ملا وجیہ الدین کے ایک شاگرد قاضی ضیاء الدین نے کسبِ فیض کیا، ان سے شیخ جمال اوران سے ملا لطف اللہ، ان سے ملا جیون صاحب نورالانوار، ملا علی اصغر، ملا محمد امان اور قاضی علیم اللہ جیسے مشہور علماء نے فیض حاصل کیا اور ہندوستان کے چپے چپے میں علوم وفنون کو ترقی دی۔ اسی عہد میں جون پور کے سلاطین نے علوم وفنون کی سرپرستی کی۔ ملا محمود مصنف شمس بازغہ، استاذ الملک محمد افضل، شیخ ابوالفتح شہاب الدین دولت آبادی، مولانا اللہ داد اور دیوان عبدالرشید جیسے صاحب فضل وکمال پیدا ہوئے جن کا سلسلۂ فیض پورے ہندوستان میں پہونچا۔

مولانا سید عبدالحی نے ہندوستان کا نصاب درس کے حولے سے ایک محققانہ مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کے عربی کے قدیم نصاب کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور میں فنون اوران میں پڑھائی جانے والی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

پہلا دور ساتویں صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری کے آغاز تک کا ہے۔ اسی دور میں مندرجہ ذیل علوم وفنون کی تحصیل معیار فضیلت سمجھی جاتی تھی۔ صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر وحدیث موضوعات ان میں شامل تھے جن میں چند خاص کتابیں داخل نصاب تھیں۔

تفسیر میں مدارک، بیضاوی اور کشاف۔

حدیث میں مشارق الانوار، مشکوۃ المصابیح کا متن مصابیح السنۃ۔

فقہ میں ہدایہ، اصول فقہ میں منار اوراس کی شروحات اوراصول بزدوی۔

علم نحو میں مصباح، کافیہ، لب الالباب، ارشاد۔

عربی ادب میں مقامات حریری۔

تصوف میں عوارف، فصوص الحکم اور کچھ عرصہ بعد نقد النصوص ولمعات۔

منطق میں شرح شمسیہ۔ علم کلام میں شرح صحائف اور بعض مقامات پر ابوشکور سالمی۔

ضیاء الدین برنی اور قاسم فرشتہ نے علاء الدین خلجی کے زمانے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ اس زمانے میں علم حدیث سے بے اعتنائی برتی جاتی تھی۔ واقعہ یوں ہے:

''مولانا شمس الدین ترک ایک مصری محدث ہندوستان میں علم حدیث کی

ترویج واشاعت کے ارادہ سے ملتان تک آکر واپس چلے گئے۔ مگر چلتے وقت بادشاہ کوایک رسالہ لکھ کر بھیج دیا جس میں اس پر بہت کچھ غیرت دلائی تھی کہ ہندوستان میں حدیث کی طرف سے علماء میں بڑی بے اعتنائی پھیلی ہوئی ہے، دنیا ساز مولویوں نے بادشاہ تک اس رسالہ کوبھی نہ پہنچنے دیا۔''[۱۰]

دوسرے دور میں بھی وہی کتابیں داخل درس تھیں بس اس میں کچھ مزید کتابوں کا اضافہ کردیا گیا۔ شرح مطالع وشرح مواقف، مفتاح العلوم سکا کی،مطول ومختصر،تلویح وشرح عقائد نسفی،شرح وقایہ اورشرح جامی کا اضافہ ہوگیا۔

ترکوں کی ہندوستان میں آمد کے تقریباً ڈھائی سو سال تک یہی نصاب رائج رہا۔اس نصاب میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ قرآن وحدیث کو بالکل نظرانداز کردیا گیا تھا۔تفسیر میں صرف ایک یا دو اور علم حدیث کی صرف دو کتابیں داخل درس تھیں، جبکہ فقہ اور اصول فقہ پر پوری توجہ مرکوز کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

''ترکوں کے ساتھ جس قسم کا سیاسی وسماجی ڈھانچہ یہاں درآمد ہوا تھا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ نئے حالات میں اس کی بنیادیں مستحکم ہوں اور یہ تقاضا قضا اور افتاء کے اداروں سے ہی پورا ہوسکتا تھا، قاضیوں اور مفتیوں کی اچھی دسترس فقہ اور اصول فقہ پر ناگریز تھی۔''[۱۱]

دور ثالث میں فتح اللہ شیرازی کی طرف سے کچھ مزید کتابوں کو داخل درس کیا گیا۔[۱۲]

چوتھا دور بارہویں صدی ہجری میں شروع ہوا اور اسی دور میں درس نظامی کے نام سے ایک نیا نصاب ترتیب دیا گیا۔

عہد وسطی کے مدارس کا نصاب

عہد وسطی کی تاریخ سے کہیں یہ وضاحت نہیں ہو پاتی ہے کہ مدرسوں کے نصاب میں کب کب اور کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں اور نہ اس کے انتظامی امور سے متعلق کوئی واضح تحریر مل پاتی ہے بلکہ مسلم مؤرخین وتذکرہ نگاروں نے جو سیاسی تحریریں چھوڑیں ہیں ان میں کہیں کہیں ضمناً تعلیم سے متعلق کوئی

بات آجاتی ہے جس کی کڑی سے کڑی جوڑنے پر کچھ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔

قدیم دور کے اسی طرز کے تعلیمی اداروں کو نمونہ بنا کر آج بھی ملک کے طول وعرض میں مختلف ادارے چل رہے ہیں۔ کسی حد تک نصاب تعلیم میں فرق موجود ہے لیکن بعض نصاب آج بھی وہی ہے جو قدیم اداروں میں تھا مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، عربی ادب وغیرہ آج بھی مدارس کے اہم نصاب میں شامل ہیں۔

عہدِ سلطنت ومغلیہ میں ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی رہی ہے اور فارسی کو ہی ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا لیکن تعلیم میں اسلامی علوم اور قرآن کو جو اسلامی علوم کا سرچشمہ ومنبع تصور کیا جاتا ہے خصوصی حیثیت حاصل رہی ہے۔

اسلامی علوم اور قرآن کے تفاسیر اس وقت تک عربی زبان میں بکثرت موجود تھے۔ اسی لیے عربی زبان وادب ایک اہم مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا تھا تاکہ قرآن اور حدیث فہمی میں آسانی پیدا ہو، یہاں تک کہ نصاب تعلیم میں غیر مذہبی علوم منطق، فلسفہ، طب، زراعت، وغیرہ کی کتابیں بھی عربی زبان میں شامل درس تھیں۔ بہر حال نصابی کتابیں جن میں تفاسیر، احادیث نبویہ، دینیات، فقہ، منطق، فلسفہ، طب، زراعت اور ایسے دوسرے علوم کی کتابیں عربی زبان میں شامل نصاب تھیں اور اسی وجہ سے عربی زبان وادب کے قواعد کو سیکھنے پر زور دیا گیا تھا۔ آج بھی مدارس کے نصاب میں عربی زبان وادب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

اسلامی علوم چونکہ ایک مذہبی علوم کے طور پر جانا جاتا تھا، پورے عالم اسلام میں قرآنی علوم اور احادیث سے متعلق شامل نصاب کتابیں تقریباً ایک جیسی تھیں یہی وجہ ہے کہ اسلامی علوم کے طلباء علم کی تلاش میں ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسہ، ایک خطہ سے دوسرے خطہ یہاں تک کہ ایک ملک سے دوسرے ملک جایا کرتے تھے۔ ہندوستان کے مشرقی حصہ کے طلباء مغربی حصہ گجرات وغیرہ آتے یا دوسرے ملک حجاز، مصر، شام، بغداد اور دوسرے ممالک جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے اور نصاب کی یکسانیت کی وجہ سے انھیں دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج بھی نصاب تعلیم کے کسی حد تک یکسانیت کی وجہ سے اسلامی علوم کے ہندوستانی طلباء واساتذہ اسلامی ممالک کے شہروں میں تعلیمی خدمات میں مصروف ہیں۔

مختلف مضامین کو پڑھانے والے مختلف اساتذہ ہوتے تھے۔بعض طلباء کوکسی ایک مضمون میں فضیلت کی جستجو ہوتی تو وہ کسی ایک استاد یا ایک مدرسہ یا ایک شہر کے پابند ہونے کے بجائے دوسرے ماہرین فن سے بھی رجوع کرتا اوراس طرح وہ علم کی پیاس بجھانے کے لیے علوم کے دوسرے مراکز کی طرف رجوع کرتا۔

نقلی وعقلی علوم کا امتزاج

اسلام نے علم کے ہر اس شعبے کو اہمیت دی ہے جو بنی نوع انسان اور انسانی سماج کے فلاح وبہبود کے لیے مفید ہے،خواہ وہ علم طب،انجینیر نگ ، باغبانی، ارتھمیٹک ، زراعت، سماجیات،علم نجوم، تاریخ یا علم جغرافیہ ہو۔

مسلمانوں نے قدیم یونانی علوم میں بھی دلچسپی لی اوراسے سیکھ کرمزید ترقی کے اعلی مدارج تک پہنچایا۔مسلم حکمرانوں نے اسے نصاب تعلیم میں شامل کیا،نتیجتا نصاب تعلیم کافی وسیع ہوگیا۔اس طرح اس نصاب میں روایتی اور مذہبی علوم نیز عقلی اور سماجی علوم شامل کرلیے گئے۔روایتی علوم میں وہ تمام شعبے شامل ہیں جن کا سرچشمہ اسلام ہے یعنی قرآن اوراس سے متعلق علوم:تفسیر،حدیث،فقہ،اصول فقہ،تجویدوقرات،علم کلام،تصوف وغیرہ جب کہ عقلی وسماجی علوم میں منطق وفلسفہ،ارتھمیٹک،علم نجوم،علم الہندسہ،علم الرجال، کیمیا، طب، زراعت، الجبرا، نیچرل سائنس،علم روح انسانی (میٹافزکس) باغبانی، تاریخ، جغرافیہ شامل تھے اور ادب میں قواعد،نحو، زبان،خطوط نویسی، خطاطی وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ بالا نصاب ہندوستان میں پندرہویں صدی عیسوی تک رائج رہااس کے بعد نصاب تعلیم میں معمولی سی تبدیلی کی گئی اوردوسرے سائنسی مضامین شامل کئے گئے۔

عہد مغلیہ میں بھی معقولات کو اہمیت حاصل تھی۔اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں شیعی عقائد رکھنے والے ایرانی آکرآباد ہوگئے،ان میں بڑے بڑے علماء ودانشوران بھی تھے۔انھیں میں میر فتح اللہ شیرازی (متوفی ۱۵۸۸ء) بھی تھے جن کو بیجاپور کے سلطان عادل شاہ نے شیراز سے بیجاپور بلوایا تھا۔ ۱۵۸۲ء میں میر فتح اللہ شیرازی کو مغلیہ شہنشاہ اکبر نے آگرہ طلب کیا،ان کی خوب عزت کی گئی، یہ مابعد الطبعیات،علم کلام، میکانک وغیرہ کے بہت بڑے عالم تھے۔انھوں نے معقولات سے متعلق کئی کتابوں

کو داخل درس کروایا۔ مغل حکمرانوں کی سرپرستی ہی کی وجہ سے معقولات کی کتابیں ہندوستان میں تقریباً تین سو برس تک داخل درس رہیں اور اس کا پلڑا بھاری رہا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے تفسیر، حدیث، فقہ اور عربی زبان وادب پر زور دیا گیا۔

عہدِ مغلیہ میں اگرچہ تعلیمی نصاب میں معقولات کو اول درجہ حاصل تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ طلباء اس کے مطابق تعلیم حاصل کرنے پر مجبور تھے بلکہ طلباء اپنے ذوق وشوق کی بنیاد پر دوسرے علوم وفنون بھی حاصل کر سکتے تھے، مثال کے طور پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ کو دیکھا جا سکتا ہے، جن کو تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور تصوف سے زیادہ دلچسپی تھی اور ان دونوں بزرگوں نے معقولات میں اتنا ہی دلچسپی لی جتنا انھوں نے زمانے کے اعتبار سے ضرورت محسوس کی۔

شاہ ولی اللہ نے "**الجزء الطیف**" میں اپنی درسیات کو اس ترتیب سے لکھا ہے:

نحو میں کافیہ، شرح جامی

منطق میں شرح شمسیہ، شرح مطالعہ

فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ

کلام میں شرح عقائد نسفی، شرح مواقف

فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ

اصول فقہ میں حسامی، توضیح وتلویح

بلاغت میں مختصر ومطول

ہیئت وریاضی میں بعض مختصر رسائل

طب میں موجز القانون

حدیث میں مشکوۃ المصابیح، شمائل ترمذی اور صحیح بخاری کا کچھ حصہ

تفسیر میں مدارک، بیضاوی۔

تصوف وسلوک میں عوارف ورسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص۔

یہ گویا مغل ادوار میں ترتیب دیا گیا نصاب تھا۔

درس نظامی

اٹھارہویں صدی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۷۶۲ء) نے نصاب تعلیم میں کچھ اصلاحات کیں لیکن اس سلسلہ میں سب سے اہم کام ملا نظام الدین سہالوی نے انجام دیا۔ موصوف ایک نامور عالم، صوفی اور فرنگی محل خاندان کے جد امجد تھے۔ ان کی تعلیمی اصلاحات ہندوستان میں اسلامی علوم کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نصاب کو درس نظامی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ قدیم نصاب میں ہر فن میں بیرون ہند کے علماء کی کتابیں شامل تھیں لیکن درس نظامی کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ہندوستانی علماء کی کتابیں شامل کی گئیں، نیز اس میں کتابوں کے بوجھ کو ختم کر کے مختصر مگر جامع کتابوں کو شامل کیا گیا، یہ نصاب ہندوستان کے طول وعرض میں نافذ کیا گیا۔ اس نصاب میں بھی روایتی علوم میں تفاسیر کے علاوہ علم حدیث میں کچھ کتابوں کا مزید اضافہ کیا گیا، لیکن سماجی علوم میں سے جغرافیہ اور تاریخ کو نظر انداز کر دیا گیا اور ادب کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ درس نظامی کا نصاب کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا؛ تفسیر، حدیث، دینیات، فقہ، اصول فقہ، منطق وفلسفہ، علم نحو، فصاحت وبلاغت، قواعد واشتقاق اور ریاضی۔ ان فنون کے تحت مختلف کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔

ملا نظام الدین سہالوی کا نصاب ہندوستان میں رائج ہوا کیونکہ ان کا خاندان برسوں سے فرنگی محل لکھنؤ میں درس وتدریس میں مشغول تھا اور لکھنؤ کو علمی اعتبار سے ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ لکھنؤ میں ایرانیوں کی کثرت کی وجہ سے ایرانی اثر غالب تھا جس کی بنا پر تعلیم پر بھی معقولات کا اثر پڑنا لازمی تھا یہی وجہ ہے کہ درس نظامی میں بھی معقولات کو ایک درجہ اہمیت حاصل تھی۔ ذیل کے خاکے سے اس کی مکمل وضاحت ہوجاتی ہے۔

نمبر شمار	نصابی کتب	مؤلف	سنہ تالیف یا سنہ وفات مؤلف
صرف واشتقاق عربی			
۱	میزان الصرف	ملا حمزہ بدایونی	(م:۹۱۱ھ)
۲	منشعب	ملا حمید الدین کاکوری	(۱۸۰۱ء)

۳	پنج گنج	سراج الدین اودھی	(۷۵۸ھ)
۴	صرف میر	میر سید شریف الجرجانی	(م:۸۱۶ھ)
۵	زبدہ	ظہیر بن محمود مسعود علوی	
۶	فصول اکبری	قاضی محمد علی اکبرالہٰ آبادی	(م:۱۰۹۰ھ/۱۶۷۸ء)

عربی نحو

۷	نحو میر	میر سید شریف الجرجانی	(م:۸۱۶ھ)
۸	شرح مائۃ عامل	ملا محمد صادق	(م:۱۱۹۰ھ)
۹	ہدایۃ النحو	ابوحیان نحوی	(م:۷۴۵ھ)
۱۰	کافیہ	امام جمال الدین ابن حاجب نحوی	(م:۶۲۰ھ)
۱۱	شافیہ		
۱۲	شرح جامی	مولانا شیخ عبدالرحمٰن جامی	(م:۸۵۰ھ)

بلاغت عربی

۱۳	تلخیص المفتاح	علامہ جلال الدین محمد قزوینی، خطیب دمشق	(م:۷۳۹ھ)
۱۴	مختصر المعانی شرح تلخیص المفتاح	سعد الدین تفتازانی	(م:۷۹۲ھ)
۱۵	مطول شرح تلخیص المفتاح	سعد الدین تفتازانی	(م:۷۹۲ھ)

ادب عربی

۱۶	مقامات حریری	ابومحمد قاسم بن علی حریری	(م:۵۱۶ھ)
۱۷	دیوان متنبّی	احمد بن حسین ابوالطیب متنبّی	(م:۴۰۰ھ)
۱۸	دیوان حماسہ	ابوتمام طائی	(م:۲۲۲ھ)
۱۹	سبعہ معلقہ	زمانہ کے مشہور شعراء	

منطق

۲۰	شرح شمشیہ (قطبی)	قطب الدین رازی	(م:۸۶۶ھ)
۲۱	رسالہ میر زاہد	میر محمد زاہد ہروی	(م:۱۱۰۱ھ)

۲۲	سلم العلوم	قاضی محبّ اللہ بہاری	(م:۱۱۱۹ھ)
۲۳	صغریٰ	میر سید شریف الجرجانی	(م:۸۱۶ھ)
۲۴	کبریٰ	میر سید شریف الجرجانی	(م:۸۱۶ھ)
۲۵	ایساغوجی	اثیرالدین ابہری	(م:۶۶۱ھ)
۲۶	شرح تہذیب تفتازانی	عبداللہ یزدی	(م:۹۸۱ھ)
۲۷	میر قطبی	میر سید شریف الجرجانی	(م:۸۱۶ھ)
۲۸	ملا جلال		

فلسفہ

۲۹	شرح میبذی علی ہدایۃ الحکمۃ	میر حسین میبذی	(م:۱۰۹۶ھ)
۳۰	شرح بازغہ	ملا محمد جونپوری	(م:۱۰۶۲ھ)
۳۱	شرح صدرا محمد بن ابراہیم	صدرالدین شیرازی	(م:۱۰۵۰ھ)

ہیئت وریاضی

۳۲	التصریح	امام الدین بن لطف اللہ لاہوری	(م:۱۱۴۵ھ)
۳۳	رسالہ قوشجیہ	علاءالدین قوشجی	(۱۴۷۴ء)
۳۴	شرح چغمنیہ	موسیٰ بن محمود قاضی زادہ	(م:۸۱۴ھ)
۳۵	بست باب	نصیرالدین محقق طوسی	(م:۶۷۲ھ)
۳۶	اقلیدس مقالہ اولی	ابوالحسن ثابت بن قرۃ	(م:۲۸۹ھ)
۳۷	خلاصۃ الحساب	بہاءالدین عاملی	(م:۱۶۲۲ء)
۳۸	تشریح الافلاک		

طب

۳۹	الموجز	ابوالحسن ابن النفیس	(م:۶۸۷ھ)
۴۰	قانونچہ	محمد بن عمر چغمینی	
۴۱	حمیات القانون	شیخ بوعلی ابن سینا	(م:۴۲۷ھ)

۴۲	شرح الاسباب	برہان الدین نفیس بن عوض کرمانی	(م:۸۲۷ھ)

عروض وقوافی

۴۳	عروض المفتاح	ابوایوب سکاکی	(م:۶۲۶ھ)

عقائد وعلم کلام

۴۴	شرح عقائد نسفی	سعدالدین تفتازانی	(م:۷۶۲ھ)
۴۵	مسامرہ	کمال الدین ابن الہمام	(م:۹۰۵ھ)
۴۶	خیالی	شمس الدین خیالی	(م:۸۷۰ھ)
۴۷	میرزاہد	مرزا محمد زاہد ہروی	(م:۱۱۰۱ھ)
۴۸	شرح مواقف	سید شریف جرجانی	(م:۱۴۱۳ء)
۴۹	شرح عقائد جلالی	جلال الدین دوانی	(م:۱۵۰۲ء)

مناظرہ

۵۰	رسالہ رشیدیہ	شمس الحق بن شیخ عبدالرشید	(م:۱۰۸۰ھ)

تاریخ

۵۱	تاریخ الخلفاء	علامہ جلال الدین سیوطی	(م:۹۸۱ھ)
۵۲	تاریخ ابی الفداء	ابوالفداء حموی	(م:۷۴۶ھ)

فقہ

۵۳	نورالایضاح	حسن ابن علی شرنبلالی	(م:۱۱۹۶ھ)
۵۴	مختصر القدوری	ابوالحسن قدوری	(م:۴۲۸ھ)
۵۵	کنزالدقائق	ابوالبرکات نسفی	(م:۴۷۰ھ)
۵۶	شرح وقایہ	صدرالشریعۃ عبیداللہ بن مسعود	(م:۵۴۳ھ)
۵۷	ہدایہ	برہان الدین علی مرغینانی	(م:۵۷۳ھ)

اصول فقہ

۵۸	اصول الشاشی	نظام الدین شاشی	(م:۷۵۴ھ)

۵۹	نورالانوار شرح المنار	شیخ احمد جیون	(م:۱۱۰۵ھ)
۶۰	مختصر الحسامی	حسام الدین محمد بن محمد بن عمر	(م:۶۴۴ھ)
۶۱	التوضیح	صدر الشریعۃ عبیداللہ بن مسعود	(م:۷۴۳ھ)
۶۲	التلویح	سعد الدین تفتازانی	(م:۷۹۲ھ)
۶۳	مسلم الثبوت	محبّ اللہ بہاری	(م:۱۱۱۹ھ)

میراث (فرائض)

۶۴	مختصر السراجی	سراج الدین سجاوندی	
۶۵	شریفیہ	سید شریف جرجانی	(م:۸۱۶ھ)

تفسیر

۶۶	جلالین	جلال الدین سیوطی وجلال الدین محلی	(م:۹۸۱ھ)
۶۷	مدارک التنزیل	امام نجم الدین عمر نسفی	(م:۷۵۳ھ)
۶۸	انوار التنزیل (تفسیر بیضاوی)	قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی	(م:۷۱۶ھ)

اصول تفسیر

۶۹	الفوز الکبیر فی اصول التفسیر	امام شاہ ولی اللہ دہلوی	(م:۱۱۷۶ھ)

حدیث

۷۱	مشکوٰۃ المصابیح	محمد بن عبداللہ خطیب تبریزی	(م:۷۶۰ھ)

اصول حدیث

۷۰	شرح نخبۃ الفکر	حافظ ابن حجر عسقلانی	(م:۸۵۲ھ)

اس پورے نصاب پر غور کرنے پر یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہندوستان میں علم تفسیر وحدیث سے بے اعتنائی برتی جاتی تھی، جب کہ عہدِ تغلق سے قبل ہندوستان کے شمالی حصہ میں ایسے بہت سے علماء موجود تھے جنہیں علم حدیث سے خاصا شغف تھا اور وہ اپنے نجی تعلیمی اداروں میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے لیکن چند برسوں تک یہ چراغ مدھم رہا، پھر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اسے روشن کیا اور انھوں نے یہ ٹھان لی کہ علم حدیث کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلائیں گے، چنانچہ وہ اسے

گجرات اور حرمین شریفین سے دہلی لائے اور اس طرح انھیں اپنے مشن میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔شمالی ہندوستان میں شیخ عبدالحق کے اس کارنامے کو آگے بڑھاتے ہوئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اوران کے خانوادے نے اسے اتنی ترقی دی کہ پورا شمالی ہندوستان اس کی روشنی سے جگمگا اٹھا اوراس کے درس کواز سرنوعظمت اور بلندی حاصل ہوئی اور حدیث کی دوسری کتابوں کے ساتھ موطا اورصحاح ستہ کا باقاعدہ درس دیا جانے لگا نیز اس وقت سے اب تک پورا ہندوستان کے مدارس میں حدیث کا یہی نصاب رائج ہے۔جن احادیث کی کتابوں کو بعد میں درس نظامی میں شامل کیا گیا وہ حسبِ ذیل ہیں۔

جامع البخاری	امام محمد بن اسماعیل بخاری	(م:۲۵۶ھ)
صحیح مسلم	امام مسلم بن حجاج قشیری	(م:۲۶۱ھ)
جامع ترمذی	امام محمد بن عیسیٰ ترمذی	(م:۲۷۹ھ)
سنن ابی داؤد	امام ابوداؤدسلیمان ابن اشعث	(م:۲۷۵ھ)
سنن نسائی	امام احمد بن شعیب نسائی	(م:۳۰۶ھ)
سنن ابن ماجہ	امام ابوعبداللہ محمد بن ماجہ	(م:۲۷۳ھ)
المؤطا	امام مالک بن انس	(م:۱۷۹ھ)
المؤطا	امام محمد بن حسن شیبانی	(م:۱۹۸ھ)
کتاب الشمائل	امام محمد بن عیسی ترمذی	(م:۲۷۹ھ)
شرح معانی الآثار	امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی	(م:۳۲۱ھ)

یہ نصاب نہایت مقبول ہوا اور اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے پورے ہندوستان کے مدارس میں نافذ کیا گیا اور تقریبا ڈھائی سو سال سے آج تک زیادہ تر مدارس کا نصاب یہی درس نظامی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جزوی طور پر اس میں کچھ تبدیلیاں اور اصلاح ہوئیں لیکن مجموعی اعتبار سے بنیادی ڈھانچہ وہی رہا۔ان تبدیلیوں اور اصلاحات کا تعلق زیادہ تر نصابی کتابوں کو شامل نصاب کرنے سے ہے،نصاب تعلیم میں تبدیلی کرنے سے نہیں۔

انیسویں صدی میں شمالی ہندوستان میں اور خاص طور پر دہلی میں جو نصاب رائج تھا اس میں

ادب، لغت نویسی، طب اور مذہبی علوم پر زور دیا جاتا تھا، ان کے علاوہ چونکہ فارسی سرکاری زبان تھی اس لیے فارسی ادب، کتابت، خطوط نویسی، تاریخ، اخلاقیات کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ملازمین کی تربیت کے لیے تعلیمی نظام میں تبدیلی کی کوشش کی اور مغربی بنگال کی بیشتر علاقوں میں اور خاص طور پر کولکاتہ کے مدارس میں اس نصاب پر عمل شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں فارسی کی سرکاری زبان کی حیثیت ختم کر دی گئی اور پھر ایک نیا نصاب ہندوستان کی سرزمین پر شروع ہوا جو انگریزوں کا پلان کیا ہوا تھا۔

لیکن اس کے باوجود وہ مدارس جو مذہبی کہلاتے تھے اپنے نصاب میں کوئی تبدیلی نہیں کی، انیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلم مفکرین اور علماء نے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اور خاص طور پر تعلیمی نصاب پر غور وفکر کرنا شروع کیا، اس وقت کے مروجہ نصاب درس نظامی میں کمی کا احساس کرتے ہوئے بنیادی تبدیلی کی گئی۔

مدارس کے نصاب تعلیم کی اہمیت اور تبدیلیوں کی افادیت

درس نظامی اپنے ابتدائی دنوں کے اعتبار سے نہایت مستحکم اور پائدار نصاب تھا اس وقت زمانہ کا مزاج یہی تھا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس نصاب کو بھی نئے سرے سے ترتیب دینے کی ضرورت تھی لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس قدیم ڈھانچہ پر نئی بنیاد رکھنے کی کوشش کی گئی، آج بھی ان مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کی بات کی جاتی ہے تو ایک طبقہ ناراضگی کا اظہار کرتا ہے حالانکہ اگر روایتی علوم میں تبدیلی نہ کر کے سماجی علوم کو اس نصاب میں جگہ دی جائے جو موجودہ زمانے کے اعتبار سے مفید ہیں تو مسلمانوں کی ترقی کی راہ اور ہموار ہو جائے گی۔

درس نظامی کے نصاب سے قبل طلباء اپنی خواہش کے مطابق کتابوں کا انتخاب کر کے تعلیم حاصل کیا کرتے تھے جبکہ درس نظامی مرتب اور رائج ہونے کے بعد طلباء کو یہ اختیار ختم ہو گیا کہ وہ اپنی مرضی اور پسند سے مضامین اور کتابوں کا انتخاب کر سکیں۔

نصاب درس نظامی کی مدتِ تعلیم سات سال ہے، یعنی ایک متوسط طالب علم اس عرصہ میں سارا نصاب ختم کر لیتا ہے۔

طریقۂ تعلیم

صدیوں سے مسلم ماہرین تعلیم کی رائے یہ ہے کہ تعلیم درجہ بدرجہ دی جائے، اس کو وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ پرائمری اور ابتدائی درجہ میں مضامین کا خاکہ پڑھایا جائے، ثانوی درجات میں انھیں تفصیل سے پڑھایا جائے جب کہ اعلی سطح پر انھیں مضامین کو اس طرح پڑھایا جائے کہ طلباء کو ان مضامین پر مکمل عبور حاصل ہو جائے۔ شاہ ولی اللہ تعلیم کے طریقوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تعلیم دینے کا طریقہ جو تجربات پر کھرا اترا ہے یہ ہے کہ پہلے شاگردوں کی ذہانت کے مطابق صرف ونحو اور قواعد کے تین چار چھوٹے مقالے پڑھائے جائیں، اس کے بعد اس کو عربی لغات کے مطالعہ کا شوق پڑھایا جائے، پھر جب شاگرد عربی زبان اچھی طرح سیکھ جائیں تو ان کو امام مالک کی کتاب مؤطا پڑھائی جائے، اس کتاب کی تعلیم کو نظر انداز نہ کیا جائے، کیونکہ اسی کے مطالعہ سے علم حدیث کے مطالعہ کی بنیاد بنتی ہے، اس کے بعد انھیں قرآن کی تعلیم معنی کے ساتھ دی جائے، تفسیر نہ پڑھائی جائے، انھیں قرآن کو سمجھنے اور قواعد کے اعتبار سے مشکل یا ان حالات پر بحث کے لیے اہل نہ بنایا جائے کہ جن حالات میں نزول وحی ہوا ہے، جب شاگرد اس میں اہلیت حاصل کر لیں تو انھیں تفسیر جلالین پڑھائی جا سکتی ہے، اور اسی کے ساتھ انھیں ایک وقت میں احادیث، دینیات، شرعی قوانین اور تصوف وغیرہ کی کتابیں پڑھنے کی ترغیب دی جائے اور دوسرے وقت میں شرح ملا جامی، قطبی جیسے علوم کی کتابیں پڑھنے کی تلقین کی جائے اگر ممکن ہو تو طالب علم ایک روز مشکوۃ کا مطالعہ کرے اور دوسرے روز شرح طیبی کے متعلقہ حصہ کا۔''[۱۳]

یہ ہے شاہ ولی اللہ کی تعلیمی نصاب میں اصلاحات کا ایک خاکہ، حالانکہ شاہ صاحب نے

باضابطہ کوئی نصاب مرتب نہیں کیا لیکن ماہرین کے لیے ایک راہ دکھادی جس کو سامنے رکھ کر ایک منظّم نصاب ترتیب دیا جاسکتا ہے۔

اس وقت اعلیٰ تعلیم کے مختلف درجات کو مختصرات، متوسطات اور مطولات یا تخصصات کا نام دیا جاتا تھا، ان درجات کے فارغین کو عالم و فاضل کہا جاتا تھا۔

حواشی

۱۔ تیونس کے ایک متمول تاجر محمد الفہری کی بیٹی فاطمہ بنت محمد الفہری القریشی عرف ام البنین جس کے نام سے سے آج بہت کم لوگ واقف ہیں لیکن امت مسلمہ کے لیے قابل فخر ہے یہ بات کہ اس علم دوست مسلم بیٹی نے دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔

فاطمہ تیونس کے شہر قیروان میں پیدا ہوئی۔ بعد ازاں اس کے والد اسے اور اس کی بہن مریم کو لے کر مراکش کے شہر فاس منتقل ہو گئے۔ والد کی وفات کے بعد دونوں بہنوں نے فیصلہ کیا کہ وراثت میں ملی دولت کو وہ مساجد اور ترویج و ترقی تعلیم میں صرف کریں گی۔ اپنے باپ کے ایصال ثواب اور صدقہ جاریہ کے طور پر انھوں نے جامع مسجد قیروان تعمیر کرائی۔ ۸۵۹ء میں اس عظیم مسلم بیٹی نے مراکش کے شہر فاس میں دنیا کی سب سے پہلی یونورسٹی جامعہ القیر وان کی بنیاد رکھی جہاں سے آج بھی علم کی شمعیں روشن کی جا رہی ہیں۔ جامعہ القیر وان کو بحیرہ روم کا سب بڑا علمی مرکز قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ یورپ کو صفر اور باقی عربی اعداد سے متعارف کروانے والے پاپائے روم پوپ سلوسٹر ثانی نے بھی یہیں سے تعلیم حاصل کی۔ فاطمہ کا سال پیدائش ۸۰۰ء ہے اور سال وفات ۸۸۰ء بتایا جاتا ہے۔

۲۔ تاریخ فرشتہ — محمد قاسم فرشہ، المیزان، لاہور (پاکستان) ۲۰۰۸ء [جلد: اول] ص: ۴۷

۳۔ جس طرح ہارون الرشید کا دور برامکہ کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہے اسی طرح سلجوقیوں کا عہد نظام الملک طوسی کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے۔ نظام الملک کا اصل نام حسن بن علی اور لقب نظام الملک تھا۔ وہ طوس کے ایک زمیندار علی کا بیٹا تھا۔ ۴۰۸ھ میں پیدا ہوا اور بچپن سے ہی بہت ذہین اور کئی خوبیوں کا مالک تھا۔ اپنی ذہانت سے انتہائی کم عمری میں کئی علوم پر عبور حاصل کیا۔ سلجوقی عہد میں وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوا۔ اس عہد کے تمام کارنامے نظام الملک کے تیس سالہ دور وزارت کے مرہون منت ہیں۔ یہ عہد سلجوقیوں کا درخشاں عہد کہلاتا ہے۔

سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے نظام الملک کی صلاحیتوں کا اندازہ لگاتے ہوئے وزارت کا منصب اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے الپ ارسلان کے عہد میں ایسے جوہر دکھائے کہ تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کی ہزاروں شمعیں روشن ہوگئیں۔ اس نے ملک کو گوشے گوشے میں مدارس کا جال بچھا دیا اور سب سے بڑا اور اہم مدرسہ بغداد کا مدرسہ نظامیہ تھا جس کی تعمیر پر بے پناہ روپیہ صرف کیا گیا۔ اس کے علمی و ادبی کارناموں کی طویل فہرست کے ساتھ مذہبی اور دینی خدمات بھی بے شمار ہیں اور رفاہ عامہ کے کارنامے تاریخ پر انمٹ نقوش ثبت کرتے ہیں۔ اس کی تحریر کردہ کتاب ''سیاست نامہ'' کو انتہائی شہرت حاصل ہوئی اور اس سے آج بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔

۴۔ **شذرات الذهب فی اخبار من ذهب المجلد الخامس —ابن العماد الدمشقی الحنبلی، دار ابن کثیر، دمشق** (بیروت) ص:۲۴۰

۵۔ **نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر** [جلد: دوم]—سید عبدالحی حسنی، مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ (حیدرآباد) ۱۹۶۶ء، ص:۲۳

۶۔ **نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر** —سید عبدالحی حسنی، **مجلس دائرة المعارف العثمانیه** (حیدرآباد) ۱۹۶۶ء [جلد: دوم] ص:۴۶، مقالہ: ہندوستان میں علم حدیث—سید سلیمان ندوی، معارف [جلد:۲۲] ص:۲۵۶

۷۔ مقالہ: ہندوستان کے عہد اسلامی میں تعلیم کا نظام، تعلیمات—سید ریاست علی ندوی، خدابخش لائبریری (پٹنہ) ۱۹۹۹ء، ص:۶۱

۸۔ مسلمانوں کا تعلیمی نظام—ضیاء الحسن فاروقی، مکتبہ جامعہ (نئی دہلی) ۱۹۹۲ء، ص:۸۱

۹۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں—مولانا ابوالحسنات ندوی، مطبع معارف ا(عظم گڑھ) ۱۹۳۶ء، ص:۸۹

۱۰۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں—مولانا ابوالحسنات ندوی، مطبع معارف (اعظم گڑھ) ۱۹۳۶ء، ص:۹۲

۱۱۔ مسلمانوں کا تعلیمی نظام—ضیاء الحسن فاروقی، ص:۵۷، مکتبہ جامعہ (نئی دہلی) ۱۹۹۲ء

۱۲۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں—مولانا ابوالحسنات ندوی، مطبع معارف ا(عظم گڑھ) ۱۹۳۶ء، ص:۹۶

۱۳۔ ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز—ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی، ص: ۲۴، ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند ۱۹۹۶ء

محمد اشفاق عالم *

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی مکتوب نگاری
ایک تنقیدی جائزہ

ہندوستان قدیم زمانے سے تہذیب وتمدن، روحانیت اور فکری گہرائیوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ اپنشدوں اور بھکتی دور کی تخلیقات اس کی روشن دلیل ہیں۔ تاہم، اس سرزمین پر جب اسلام کا نور پھیلا تو بہت جلد تصوف بھی متعارف ہوا۔ تصوف نے نہ صرف تزکیۂ باطن اور تصفیۂ اخلاق کی راہیں ہموار کیں، بلکہ ہندوستانی ادب پر بھی اپنے گہرے اثرات ثبت کیے۔ اس نے یہاں کی فکری و ذوقی روایت کو جلا بخشی اور انسانی روح کو سچائی، محبت، اخلاص اور عشق حقیقی کے راستے پر گامزن کیا۔

صوفیہ نے ادب کو انسانی زندگی کی حقیقت کو آشکار کرنے کا وسیلہ بنایا۔ یہ محض الفاظ کی بازی گری، جملوں کی زیب وزینت اور اسلوب کی آرائش کا ذریعہ نہیں تھا، بلکہ انھوں نے ادب کے ذریعے انسان کے باطن میں پوشیدہ حسن وعشق، سوز وگداز اور درد والم کو اجاگر کیا۔ صوفیہ نے اس کام کے لیے شعروشاعری، مکتوب نگاری، ملفوظاتی ادب اور نثری ادب کا بھی سہارا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی ادب خصوصاً اردو، فارسی اور ہندی کی ادبی روایت صوفیانہ فکر کے بغیر ادھوری ہے۔

صوفی ادب میں مکتوب نگاری کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس کے ذریعے متعدد ایسے

* ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

شاہکار تخلیقات وجود میں آئیں، جو اردو اور فارسی کی ادبی روایت میں ایک قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی ''مکتوبات قدوسیہ'' اسی ادبی روایت کا اہم ترین اور سنہری حصہ ہے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا شمار سلسلہ چشتیہ کے ان عظیم صوفیائے کرام میں ہوتا ہے جن کی تعلیمی، تربیتی اور تبلیغی خدمات اور مساعی کی بدولت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اسلام پہنچا اور اصلاح و تربیت کا کام بڑے پیمانے پر انجام پذیر ہوا۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی ولادت ۸۵۲ھ مطابق ۱۴۵۰ء ردولی میں ہوئی۔ شیخ صاحب کے والد شیخ اسماعیلؒ خود ایک ذی علم انسان تھے۔ اس لیے انھوں نے بچپن ہی سے اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ پھر مختلف علماء سے استفادہ کیا۔ بعدازاں تصوف کی طرف مائل ہوئے اور شیخ عبدالحق ردولویؒ کے مزار کی جاروب کشی اختیار کر لی۔ شیخ صاحب شیخ عبدالحق ردولوی کے باطنی خلیفہ ہیں۔ حصولِ خلافت کے بعد شیخ عبدالقدوس ردولی ہی میں مقیم رہے مگر جب ردولی کے حالات زیادہ خراب ہو گئے تو عمر خاں شیرانی حاکم شاہ آباد کے اصرار پر ۸۹۶ھ مطابق ۱۴۹۱ء میں مع اہل و عیال شاہ آباد منتقل ہو گئے اور تقریباً تیس سالوں تک شاہ آباد میں ارشاد و تلقین کا میں مصروف رہے۔ لیکن سلطان محمد بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا اور سلطان ابراہیم کو شکست دے کر تخت سلطنت پر خود جلوہ افروز ہوا۔ افغان سرداروں کی کثرت کی وجہ سے شاہ آباد ویران ہونا شروع ہوا، یہ منظر دیکھ شیخ صاحب نے گنگوہ کا رخ کیا اور آخر وقت تک وہیں مقیم رہے۔[1]

ان کی عمر کا زیادہ تر حصہ ریاضتوں، مجاہدوں، عباداتِ الٰہی اور مریدوں کی اصلاح و تربیت میں گزرا مگر ان تمام مشغولیات کے باوجود انھوں نے اپنی غیر معمولی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے متعدد کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں درج ذیل کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔(۱) **شرح عوارف المعارف (۲) رسالۂ قدّوسی (۳) رشدنامه (۴) انوار العیون (۵) مظهر العجائب (۶) رساله قرة العین (۷) مکتوبات قدّوسیه** وغیرہ۔

مکتوبات قدوسیہ

مکتوب نگاری دراصل ایک انسان کے اپنے احساسات، افکار اور تجربات کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر کسی مخصوص فرد تک پہنچانے کا فن ہے۔ مکتوبات ایک دور کی تہذیب، معاشرت اور فکری

روش کا آئینہ ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مکتوب نگاری ادب کی ان قدیم ترین اصناف میں شمار ہوتی ہے جنہوں نے انسانی جذبات کو زمان ومکان کی قید سے آزاد کر کے دائمی رنگ عطا کیا ہے۔

ہر مکتوب کا رنگ، لب ولہجہ اوراس کی معنویت جداگانہ ہوتی ہے۔چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ چاہے وہ کسی بزرگ کا مکتوب ہو یا کسی عاشق کا، کسی مصلح کا خط ہو یا کسی شاعر کا، ہر مکتوب میں ایک منفرد دنیا سانس لیتی ہے۔جب اہلِ قلم نے اس فن کو اپنایا، تو مکتوب ایک ادبی صنف کی صورت اختیار کر گیا۔ اس میں اسلوب کی لطافت، خیالات کی تہ داری اور جذبات کی پاکیزگی نے اسے محض پیغام رسانی سے بلند کر کے فنِ اظہار کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا۔

سرمایہ ادب وتصوف میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مکاتیب کو خاص اہمیت حاصل ہے، یہ مکاتیب نہ صرف فارسی ادب میں اسلوب نگارش،طرز ادا، فصاحت وبلاغت اور بلندترین انشاء پردازی کا ایک شاہ کار ہیں بلکہ تصوف کے اہم رموز ونکات، علمی مسائل کی توضیحات، عقائد واعمال کی تشریحات، ترویج دین، اشاعت اسلام اور رشد وہدایت کے اہم ابواب پر مشتمل ہیں۔یہ مکتوبات جہاں حضرت شیخ کی علمیت، تبحر اور روحانی افکار وخیالات کے آئینہ دار ہیں، وہیں حضرت شیخ کی پرخلوص جدوجہد اور سلسلہ چشتیہ صابریہ کی ترقی اور فروغ کے لیے ان کی کوششوں کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے۔یہ مکتوبات حضرت شیخ کی علمی اور عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ہمارے سامنے اس طرح لاتے ہیں کہ ایک قاری کے سامنے حضرت شیخ کی شخصیت پوری طرح سے آجاتی ہے۔

ان مکتوبات کو آپ کے مرید وخلیفہ شیخ بڈھن بن رکن الدین جونپوری مشہور بہ میاں خان ابن قوام الملک نے جمع کیا تھا جو پہلی مرتبہ نواب سکندر علی خاں والی ریاست مالیر کوٹلہ کی فرمائش پر مطبع احمدی دہلی سے ''مکتوبات قدوسیہ'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔یہ مجموعہ ایک سو ترانوے مکتوبات پر مشتمل ہے اوراس کے علاوہ آخر میں چھ خطوط جو حضرت شیخ کے بڑے صاحبزادے شیخ حمید کے کتب خانے سے برآمد ہوئے تھے بطور ضمیمہ شامل کیے گئے ہیں۔یہ خطوط اس دور کے سلاطین، امراء، صوفیاء، علماء، عمال حکومت، صاحبزادوں، بھائیوں، خلفا ومریدوں اور دوستوں کے نام ہیں۔[۲]

مکاتیب قدوسیہ کا وہ قلمی نسخہ جو جامع مکاتیب شیخ بڈھن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔اس نسخے کے آخری صفحات غائب ہیں، اس کے سرورق پر

فدوی عالم گیر بادشاہ کی مہریں ہیں جن سے خیال ہوتا ہے کہ یہ نسخہ شاہی کتب خانے میں رہا ہے۔

شیخ عبدالقدوس کے خطوط کا اسلوب نہایت سادہ، رواں، مگر گہرا اور روح پرور ہوتا ہے۔ ان کے جملوں میں تصنع اور بناوٹ کے بجائے اخلاص، دردمندی اور فکری گیرائی نظر آتی ہے۔ ہر مکتوب ایک مستقل نصیحت، ایک روحانی پیغام اور ایک تربیتی نسخہ ہوتا ہے۔ ان کا انداز خطاب نہایت مشفقانہ، مگر پُر اثر ہوتا ہے۔ مخاطب سے قرب اور تعلق کی شدت ہر سطر میں جھلکتی ہے۔ شیخ صاحب نے ایک بار اپنے ایک مرید خاص کو ایک طویل مکتوب لکھا اور انھیں ایمان و عمل صالح کی طرف اس انداز میں متوجہ فرمایا:

"کاش مرغِ روحِ علوی، کہ از گلشنِ وحدت پرواز کردہ و بدین عالم فرود آمدہ است، دیدۂ بینا می گشود و عجائب و غرائبِ عالمِ الٰہی و کمالات و جمالاتِ بی حد و بی نہایت را تماشا می کرد و بہ حقیقتِ خویش و ذاتِ حق تعالیٰ واقف می گشت، و با صد ہزار اشتیاق و صد ہزار آتشِ عشق، از آفاق درگذشتہ، بہ لقای دوست نائل می شد، کہ آن را ایمان و عملِ صالح نامند۔"

ترجمہ: کاش کہ طائر روح علوی جو گلشن وحدت سے پرواز کر کے اس جہان میں آیا ہے، آنکھ کھول کر عجائب و غرائب خداوندی اور کمالات و جمالات بے نہایت اور بے غایت کو دیکھتا اور اپنی اور حق تعالی کی حقیقت کو پہنچانتا اور صد ہزار اشتیاق اور صد ہزار آتش عشق کے ساتھ آفاق سے گزر کر دوست تک رسائی حاصل کرتا جس کا دوسرا نام ایمان اور عمل صالح ہے۔[۳]

چنانچہ انھوں نے ایک بار سکندر لودھی کو ایک طویل مکتوب ارسال کیا اور اس کو مخلوق خدا بالخصوص علماء و صلحاء کے ساتھ حسن سلوک و تیمارداری اور غم خواری کی نصیحت فرمائی۔ اس مکتوب کا ایک اقتباس ذیل میں ذکر کیا جا رہا ہے، لکھتے ہیں:

"شغلِ جہانداری (انتظامِ سلطنت) از اشرف و اعلیٰ مشاغل شمردہ می شود، و جامعِ مشاغلِ اولیا و اتقیا، علما و صلحاو

مجاهدین فی سبیل الله عدل است؛ زیرا یك ساعت عدل، از شصت سال عبادتِ دیگران برتر و افضل است۔ بقای دین و استحکامِ سلطنت بر عهدهٔ پادشاهِ وقت است، و این وظیفهٔ عظیم را باید به صدق و اخلاص انجام دهد۔"

ترجمہ: شغل جہاں داری (انتظام سلطنت) نہایت اعلیٰ واشرف شغل ہے اور تمام اولیا واتقیا، علما وصلحا، مجاہدین فی سبیل اللہ کا جامع شغل عدل ہے کیوں کہ ایک ساعت کا عدل دوسروں کی ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر و افضل ہے۔ دین کی بقا اور سلطنت کا استحکام بادشاہ وقت کی ذمہ داری ہے۔[۴]

مغل ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور ابراہیم لودھی کو شکست ہوئی، چنانچہ ہندوستان میں اب مغلیہ دور کا آغاز ہوا۔ اور ظہیر الدین محمد بابر تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس وقت بھی شیخ عبدالقدوسؒ نے بادشاہ کو مکتوب لکھ کر نصیحت کی اور شیخ صاحب کا یہ مکتوب بھی ادبی اعتبار سے اہم ہے۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے:

"باید و مگذار که برای شکرِ نعمتِ مُنعِم، سایهٔ عدل بر عالَمیان چنان کشند که هیچ کس بر هیچ کس ظلم نکند و همهٔ خلق و همهٔ سپاه، با اوامر و نواهیِ شرعِ مستقیم و مستدیم باشند، نماز به جماعت بگذارند، و علمای دین را دوست بدارند، و در بازار هر شهری محتسبان بگمارند تا شهر و بازار را بـه جمالِ عدلِ شرعِ محمدی بیارایند و روشن و به نور گردانند ... چنان که در عهدِ سلف و خلفای راشدین، با جمیعِ شرایط، بی شبه بود۔"

ترجمہ: آپ کو لازم پکڑنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کی نعمت کے شکرانے میں خلق خدا کے ساتھ اس قدر عدل وانصاف کیا جائے کہ کوئی شخص دوسرے پر ظلم نہ کر سکے

اور ساری رعایا اور ساری افواج شریعت کی پابندی میں کمر بستہ ہو جائے ،نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں ،علم اور علما کی صحبت اختیار کریں ، ہر شہر اور ہر بازار میں ہر شخص محتسب بن جائے تا کہ ہر کوچہ و بازار جمال شرع محمدؐ سے منور ہو جائے اور سارا ملک خلفائے راشدین کے عہد کی طرح اسلام کی شعاعوں سے روشن ہو جائے ۔ دین اسلام کو فروغ حاصل ہو...... ہر علاقے میں نیک اور پاک باز عہدہ دار تعینات کیے جائیں ، واجبات شرع کے مطابق وصول کیے جائیں تا کہ دین و دنیا یکجا ہو کر اسلام کا حسن بالا کریں ۔[۵]

شیخ عبدالقدوس کے خطوط میں عقیدے ، عمل ، تزکیۂ نفس ، اخلاص ، ریاضت ، محبتِ الٰہی اور پیرویٔ سنت جیسے موضوعات بار بار آتے ہیں ۔ وہ اپنے مریدین کو کمالِ صبر ، رضا ، توکل اور فنا فی اللہ کی منزل کی طرف مائل کرتے ہیں ۔ ان کے مکاتیب میں نہ صرف صوفیانہ اصطلاحات کا ذکر ملتا ہے ، بلکہ قرآن و حدیث کی روشنی میں دلائل بھی پیش کیے جاتے ہیں ، جس سے ان کی دینی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ واحد بخش سیال لکھتے ہیں :

''حضرت اقدس کے مکتوبات بھی حقائق و معارف لدنی ، اسرار و رموز کون و مکانی سے لبریز ہیں اور حد درجہ ذوق و شوق ، سوز و گداز ، ہجر و فراق ، آہ و بکا اور نالہ و فریاد میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ چونکہ حضرت اقدس کے یہ خطوط آپ کی بلند ترین خلفا و مریدین کے سوالات کے جواب میں لکھے گئے ہیں ، اگر چہ عام سطح سے ذرا اوپر ہیں لیکن متلاشیان راہ حقیقت کے لیے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں ۔''[۶]

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خطوط میں صوفیانہ ادبی اسلوب کی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کی وجہ سے انھیں فارسی مکتوب نگاری کی تاریخ میں بلند مقام حاصل ہے ۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی لکھتے ہیں :

''مکتوب نگاری کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اسلوب تحریر ، الفاظ کا انتخاب ، جملوں کی ساخت سب کا موضوع کے ساتھ تعلق ہو ۔ ایک موضوع ایسا ہے جس کا مقصد قارئین میں انبساط پیدا کرنا ہے ۔ دوسرا موضوع ایسا ہو سکتا ہے جس کا

مقصد قارئین کے احساسات کوجھنجھوڑ نا ہے۔دونوں موضوع مختلف اسالیب بیان کے متقاضی ہیں۔مکتوب کی پچاس فی صد کامیابی کاانحصاراس کے اسلوب بیان پرہوتا ہے۔''[۷]

ان کی نثر میں ایک فکری شیرینی،تاثر کی شدت اور جذبات کی لطافت پائی جاتی ہے۔بعض خطوط تو ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا نثر میں لکھی گئی شاعری ہیں۔ان کے مکتوبات میں فارسی الفاظ کا برمحل استعمال،فکری ربط، اور بلاغت و بیان کی مہارت واضح نظر آتی ہے۔بعض مکتوبات میں تشبیہات و استعارات بھی نظر آتے ہیں، جوان کے ذوقِ ادب کی دلیل ہیں۔ان مکتوبات کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں جابجا فارسی اور ہندوی اشعار کا ایسا برمحل استعمال ہے،جس سے بڑی سے بڑی بات کونہایت خوب صورت، دل نشیں اور کم ترین الفاظ میں اس طرح بیان کر دیا گیا ہے کہ وہ قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتی ہے:

کے نہ دہد نشاں ز آب و گل من
حل می نشود دریں جہاں مشکل من
کز ہیبتِ آن دو راہ، خوں شد دل من
تاخود بکدام راہ بود منزل من

ترجمہ: میری آب وگل یعنی وجود کی حقیقت کوئی مجھے نشان دہی نہیں کرتا اس جہاں میں میری مشکل حل نہیں ہوتی۔ان دو راستوں کی ہیبت سے یعنی دوزخ وبہشت یا سعادت وشقاوت کی ہیبت سے میرا دل خون ہوگیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کس راہ پر میری منزل ہوگی۔[۸]

شیخ عبدالقدوسؒ خود بھی فارسی اور ہندی شاعری پر کامل دسترس رکھتے تھے۔اسی لیے ان کی تصانیف اور مکاتیب میں اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔شیخ صاحب کوقدرت کی جانب سے ایک والہانہ طبیعت عطا ہوئی تھی۔عشق آپ کے خمیر میں شامل تھا۔جذباتِ عشق ومحبت کو جہاں کہیں بھی آپ نے اپنے اشعار میں سمویا ہے، وہیں اثر وتاثیر کے اعتبار سے اشعار کوایک نئی کیفیت عطا کی ہے۔آپ نے فکرِ رَسا کے ذریعے تصوف کے مشکل مسائل اور دقیق نکات کو اپنی شاعری میں حسن ودلکشی کے سانچے

میں اس طرح ڈھالا ہے کہ پڑھنے والا ایک خاص لطف و سرور محسوس کرتا ہے۔ آپ کے کلام میں بھرپور رچاؤ، لذت، کیفیت، سادگی، دل نشینی، سوز و گداز اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔ آپ کی شاعری کا اخلاقی لب و لہجہ بہت بلند ہے، جس میں آفاقیت، بلندی اور عظمت پوری طرح محسوس کی جاسکتی ہے۔ سوز عشق الٰہی اور درد محبت سے بے قرار ہو کر فرماتے ہیں۔[۹]

در شور عشقِ جاناں غمہائے ہر دو عالم
درد ے ست درد مارا در جام سر عالم
در شوق دوست یارب جاں برکنم بہر دم
تاجانِ جاں نیابم باجان و دل بنالم
از جان و دل گزشتم برسرِّ جاں برفتم
دیدیم سِرّ ح را حق س جملہ عالم

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے اپنی مشہور کتاب ''اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' میں شیخ صاحب کے چند دوہے نقل کیے ہیں جنہیں ہم یہاں بجنسہ درج کرتے ہیں۔[۱۰]

یہ جگ ناہیں باج پی بوجھ برہم گیانی
سو پانی، سو بلبلا سوئی سردر جان
ایکی اوہو، ایکی ماس، ایکی سردر ایکی ہانس
گرمکھ بوجھ برہم گیان تین ترلوک ایک جان

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مکتوبات ادبی اور فنی اعتبار سے فارسی زبان کی شاہ کار رہے۔ مگر ان کی مکتوبات پر بہت کم توجہ دی گئی ہے جب کہ اعجاز الحق قدوسی نے اپنی کتاب ''اقبال کے محبوب صوفیہ'' میں بھی شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو شامل کیا ہے۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مکتوبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ صوفی، صاحبِ کشف و بصیرت رہنما اور فارسی ادب کے کہنہ مشق ادیب تھے۔ ان کے مکتوبات میں جو فکری گہرائی، روحانی حرارت اور اسلوب کی لطافت پائی جاتی ہے، وہ انھیں فارسی مکتوب نگاری کی تاریخ

میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ان کے مکاتیب کا دائرۂ اثر صرف مخاطب تک محدود نہیں رہتا بلکہ آج بھی پڑھنے والوں کے دلوں کو جھنجھوڑ دیتا ہے، ذہنوں کو جلا بخشتا ہے اور روح کو تازگی عطا کرتا ہے۔شیخ عبد القدوسؒ کی نثر ہو یا نظم، دونوں میں ایک والہانہ عشق، فکری ربط، سوز و گداز اور جمالیاتی حسن جھلکتا ہے۔ان کے ہاں مکتوب، شاعری اور تعلیم، تینوں فنون باہم آمیختہ ہو کر ایک مکمل روحانی و فکری تجربہ بن جاتے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے مکتوبات پر مزید علمی و تحقیقی کام کیا جائے، تاکہ اردو و فارسی ادب اور اسلامی روحانی ورثے کے اس قیمتی خزانے سے نئی نسلیں زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔

حواشی

۱۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات — اعجاز الحق قدوسی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ (کراچی) ۱۹۶۱ء، ص:۱۴۵
۲۔ ایضاً، ص:۴۳۴
۳۔ مکتوباتِ قدوسیہ — شیخ عبدالقدوس گنگوہی، ترجمہ: مولانا واحد بخش سیال چشتی، الفیصل، اردو بازار (لاہور) ۲۰۱۰، مکتوب نمبر:۱۳، ص:۸۳
۴۔ ایضاً، مکتوب نمبر:۳۴، ص:۱۴۶
۵۔ ایضاً، مکتوب نمبر:۱۶۹، ص:۶۴۷
۶۔ مکتوباتِ قدوسیہ — شیخ عبدالقدوس گنگوہی، ترجمہ: مولانا واحد بخش سیال چشتی، الفیصل، اردو بازار (لاہور) ۲۰۱۰ء، ص:۵۴
۷۔ اردو مکتوب نگاری: سرسید اور ان کے رفقا کے خصوصی حوالے سے — شاداب تبسم، مکتبہ جامعہ (نئی دہلی) ۲۰۱۲ء، ص:۲۴
۸۔ مکتوباتِ قدوسیہ — شیخ عبدالقدوس گنگوہی، ترجمہ: مولانا واحد بخش سیال چشتی، الفیصل، اردو بازار (لاہور) ۲۰۱۰ء، ص:۵۶
۹۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات — اعجاز الحق قدوسی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ (کراچی) ۱۹۶۱ء، ص:۴۱۰
۱۰۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ — مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو [ہند] (دہلی) ۱۹۸۸ء، ص:۳۴

فضل الرحمن اصلاحی قاسمی *

کشتِ دل۔ایک مطالعہ

مشرقی یوپی کا یہ زرخیز خطہ جو اعظم گڑھ کے نام سے ہند ہی نہیں بیرون ہند میں مشہور و معروف ہے۔ بقول حقانی القاسمی: ''اعظم گڑھ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کا ہر قصبہ مانک مول ہے۔اگر علم سونا ہے تو اعظم گڑھ یقیناً سونا اگلنے والی زمین ہے جسے راجہ بکرماجیت کے بیٹے راجہ اعظم خاں نے ۱۶۶۵ء میں آباد کیا تھا۔'' (بزم سہارا، ستمبر ۲۰۱۱ء)

اسی خطے سے بسمل اعظمی کا بھی تعلق ہے۔ان کا شعری ذوق ان کے ماموں اکمل اعظمی کا رہین منت ہے جو کہ علامہ اقبال سہیل کے شاگرد تھے۔اسی بنا پر اس مجموعۂ کلام کو ان کے نام یوں انتساب کیا گیا ہے۔

''علامہ شبلی نعمانی اور اقبال سہیل کے حوالے سے مرتضیٰ حسن اکمل (اساڑھوی) اعظمی کے نام

در جہانِ شاعری اکمل زفیضان سہیل
خوشہ چینِ خرمن شبلی نعمانی منم
اکمل اعظمی

(سرنامہ کشتِ دل)

* معاون رفیق دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ای میل:islahi1980@gmail.com

حضرت عمرؓ بہترین اشعار کی کھل کر تعریف کرتے تھے اور ایسے شعر کہنے والے شعرا کی حوصلہ افزائی بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا مشہور قول ہے: "انّ محاسن الشعر تدلُّ علی مکارم الاخلاق " یعنی بہترین اشعار اچھے اخلاق کا پتہ دیتے ہیں۔

ایسے ہی بامقصد شاعری کرنے والوں کو تلمیذ الرحمٰن کہا گیا ہے۔ مقدمہ شعروشاعری میں مولانا الطاف حسین حالی نے ایک جگہ شاعری کا ملکہ بیکار نہیں کے عنوان سے بامقصد شاعری کے متعلق لکھا ہے:

> "دنیا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی ایسے پیدا ہوئے ہیں جن کو قدرت نے اسی کام کے لیے بنایاتھا اور یہ ملکہ ان کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا۔ اگرچہ اکثر نے اس ملکہ کو مقتضائے فطرت کے خلاف استعمال کیا پس ایک ایسے عطیہ کو جو قدرت نے عنایت کیاہو صرف اس وجہ سے کہ اکثرلوگ اس کو فطرت کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔کسی طرح عبث اور بے کار نہیں کہا جاسکتا۔"(مقدمہ شعروشاعری،ص:۸۲،۸۳)

بسمل اعظمی کی شاعری بھی ایک بامقصد شاعری ہے۔قدرت نے انھیں اس فن میں مہارت عطا کی ہے۔'کشتِ دل' ان کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔اس سے پہلے ان کے دو مجموعے 'رقص بسمل اور 'گزرگاہِ خیال' شائع ہوکر قبول ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر حدیث انصاری صدر شعبۂ اردو اسلامیہ کریمیہ اندور نے بسمل اعظمی کو ذوالنورین شاعر قرار دیا ہے۔ چنانچہ کشتِ دل کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> "شعروادب کی دنیا میں وہی فکروشعور زندہ اور تازہ رہتاہے جو اپنے زمانے کے مخصوص تقاضوں کا اظہار خوب صورتی سے کرتاہے۔ ہر دور میں ادبا وشعرا کی لمبی فہرست ہوتی ہے ……ہر جدید زمانہ اور اس کا

جدید فکروشعور صحت مند روایت کی نئی کڑی بن کر جدیدیت کی طرف قدم بڑھاتاھے اور انھیں قدیم وجدید رویوں کے درمیان فعال اور خلاق شاعرنیا ادب تخلیق کرتاھے جس میں اثر آفرینی استحکام اور عصری روحانی تشنگی کی غذا کے تمام اجزا شامل ھوتے ھیں۔"

آگے بسمل اعظمی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"بسمل اعظمی کی غزلیه اور نظمیه شاعری بھی انھیں قدیم وجدید رویوں کے تانے بانے کے باھمی اتصال سے وجود میں آتی ھے اس اعتبارسے یه ذوالنورین[۱] شاعر ھیں ۔"(ص:۸)

روزنامہ انقلاب ممبئی کا مبصر کشتِ دل پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے:

"کشتِ دل محمد ایوب بسمل اعظمی کا تیسرا شعری مجموعه ھے ۔ اس سے قبل ان کے مجموعے 'رقص بسمل' اور'گزرگاہ خیال'، شائع ھوکر قبول عام ھوچکے ھیں ۔ سابقه دونوں مجموعوں کی طرح 'کشتِ دل' بھی دو حصوں میں منقسم ھے۔ پھلا حصه غزلوں پر مشتمل ھے جب که دوسرے حصے میں موضوعاتی نظمیں شامل ھیں ۔"(۱۴/۱/اکتوبر۲۰۱۶ء)

ایسے ہی زادسفر کے ایڈیٹر کشتِ دل پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ان (بسمل اعظمی) کی شاعری میں وہ سب محاسن

۱۔ یہاں پر راقم السطور کو اس تعبیر سے سخت اختلاف ہے یہ ڈاکٹر حدیث انصاری صاحب کی حدیث دلبراں تو ہوسکتی ہے چوں کہ ان الفاظ کی حقیقت کو سمجھنے میں ان سے لغزش ہوئی ہے کیوں کہ یہ جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا لقب حضرت عثمان ذوالنورین کی شخصیت ہی کے لیے موزوں ہے اور انھیں لقب دینا ہی تھا تو قدیم وجدید کا سنگم وغیرہ جیسے لقب سے نواز سکتے تھے۔

ھیں جو ایک قادرالکلام شاعر کی شاعری میں ھونے
چاھیے......ان کی غزلوں میں تغزل کا رنگ
بھرا ھوا ھے۔(پشت کشتِ دل)

آیئے سب سے پہلے ان کی غزلیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔

غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا۔عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کرنا۔لیکن شاعری میں ایک خاص صنف کے لیے اس کا اطلاق ہوتا ہے اور آج تو اس کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے اور روزافزوں اس کا دامن طراز ہوتا چلا جا رہا ہے۔غزل کی اسی معنویت کو دیکھتے ہوئے رشید احمد صدیقی کو کہنا پڑا ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے''۔(تاریخ ادب اردو—نورالحسن نقوی)

کشتِ دل میں پہلے غزلوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے جو ص:۲۸ سے شروع ہو کر ص:۱۱۶ پر ختم ہوا ہے۔راقم السطور کی دانست میں کشتِ دل کا تخلیق کار ایسے شعرا میں داخل ہے جو غزلوں کے ذریعہ سے اپنی ایک پہچان بنائی ہے۔اسی تناظر میں جب کشتِ دل کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنا دل نکال کر قوم کے سامنے رکھ دیا ہے۔چند اشعار اس قبیل کے درج ذیل ہیں:

تاریخ قرن وسطیٰ کی ہے آج تک گواہ
حبِّ وطن ہے کس میں خطا کار کون ہے

تحریک اختلاف کا بانی ہے اصل کون
منظر میں کون ہے پسِ دیوار کون ہے

انداز انتقام کا یہ رنگ بھی تو دیکھ
مجرم ہے کون اور سرِ دار کون ہے

ایسے ہی قوم کی بے حسی کا نوحہ بڑے ہی دل گیر لہجوں میں کیا ہے۔چنانچہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بے حسی رہتی ہے جب مدِمقابل تنہا
زندگی ڈھونڈتی رہ جاتی ہے منزل تنہا

سب نے تو بانٹ لی ہے صبح مسرت مل کر
طے کیے ہم نے شبِ غم کے مراحل تنہا
خوفِ گرداب تلاطم تھا جنھیں بھاگ گئے
بس کھڑارہ گیا میں ہی سرِ ساحل تنہا

مذکورہ دعویٰ پر ڈاکٹر چمن آرا خاں کا یہ اقتباس دلیل ہے:

" بسمل اعظمی کے ان اشعار سے کتنا درد ٹپکتاھے ۔ وہ حق گوئی، انصاف اور اعلا قدروں کے خواھاں ھیں ۔ سماجی نابرابری ، تعصب اور تنگ نظری پر کفِ افسوس ملتے ھوئے وہ اپنے دل کو کچھ اس طرح سمجھاتے ھیں:

یہ سچ ہے اے بسمل زخم دل نہیں بھرتے
بوجھ کم تو ہوتاہے حال دل سنانے میں

ان کی غزلوں کی لمبی فہرست میں مندرجہ ذیل عناوین کے تحت چند قابل ذکر غزلیں ہیں جو وارداتِ قلب کی ترجمان معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً عزم وحوصلہ ٔہمت ، اپنے جذبات کی سوغات ، زندگی میں بڑی مشکل ہے۔ بےحسی رہتی جب ، دوستوں کے لیے کچھ......، کٹ گئی عمر مری......رنج وغم کس کے اختیار......پھر مرے زخموں سے،خون بھری دہر کی تشکیل......شبِ فراق یوں اکثر، جونہیں جانتے دوا کیا ہے، اب شہر سیاست کا دستور، صلح جوئی کا نیاباب لیے آیا ہوں، ایک واعظ دوسرا ناصح وغیرہ وغیرہ۔

اب چند غزلوں کے منتخبہ اشعار جو اس قبیل میں آتے ہیں۔ ہدیۂ قارئین ہیں:

میں نے جو عمر گزاری ہے سیہ راتوں کی
ایسے لمحات کی سوغات کسے پیش کروں
دوستی کے بھی آداب ہیں
ہر کسی کو نہ اپنا کہو
یاد مدھم نہ پڑنے لگے

زخم دل پھر سے تازہ کرو
حق شناسی، حق پرستی اور حق گوئی کے ساتھ
زندگی کو مرحلہ درپیش ہر منزل میں ہے
یہ دنیا جب سے خود سر ہوگئی ہے
زبوں حالی مقدر ہوگئی ہے
کہاں مہر و مروت کیسا رشتہ
سیاست بد سے بدتر ہوگئی ہے

ایسے ہی اس مجموعے میں نظموں کا ایک معتدبہ ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے ہی اس کے عناوین اپنی طرف مائل کرنے لگتے ہیں۔ جیسے خوں نابۂ دل، ماں کی یاد، مردمومن، ہوا کا رخ، استاد، اردو ہے جس کا نام، تعلیم، زادسفر، محمد ایوب واقف، میری بیٹی، نذر عالم اعظمی، یہ بمبئی کی سرزمین وغیرہ۔

اردو کے مشہور شاعر منوررانا صاحب نے ماں کی ممتا میں ایسی پردرد نظمیں لکھی ہیں کہ یہی نظمیں ان کی امتیازی شناخت بن گئیں۔ اکثر شعرا نے بھی ''ماں'' کے عنوان سے نظمیں لکھی ہیں۔ خود علامہ اقبال نے اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا ہے اور ان کی محبتوں کی تصویر کشی کی ہے وہ لائق تحسین وعدیم المثال ہے۔

بسمل اعظمی صاحب نے بھی اپنی والدہ کی یاد سے سرشار نظر آتے ہیں۔ ماں کی ممتا نے ان سے یہ بہترین نظم تحریر کروائی ہے جو ایک آزاد نظم ہوتے ہوئے بھی پڑھنے والے کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ اس کے چند اشعار لائقِ مطالعہ ہیں:

آج پھر میں نے تجھے یاد کیا ہے اے ماں
آج پھر غم میں ترے میں بھگوئیں پلکیں
آج تڑپا ہوں تیرے غم میں کئی ماہ کے بعد
آج پھر یاد تری آئی بچپن کی طرح
بھوک اور پیاس میں ممتا تری تڑپاتی ہے

جاگ جاتا ہوں جو راتوں میں تو سوتا ہی نہیں
دھوپ بڑھتی ہے تو آنچل ترا یاد آتا ہے
بھوک اور پیاس میں ممتا ترے تڑپاتی ہے

علامہ اقبال نے ''مردِمومن'' کی اصطلاح ایسے کامل مومن کے لیے وضع کی تھی جو سچ مچ اسلام کا نمائندہ ہو، جس کی سیرت و کردار کی قسمیں کھائی جاسکیں۔ چنانچہ ان کی کلیات میں مردانِ خدا، مردِ مسلماں اور مردِ بزرگ کے عنوان سے نظمیں موجود ہیں۔ ان کا یہ شعر اکثر لوگوں کی زبان پر رہتا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ایسا لگتا ہے کہ بسمل اعظمی کی نظم 'مردِمومن' بھی علامہ اقبال کی 'تصورِ مردِمومن' کی غماز و داعی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ مسدس کے فارم میں بسمل صاحب بڑے فارم میں دکھائی دیتے ہوئے گویا ہیں:

اندھیرے پھر بڑھ رہے ہیں ہر سو
چلا ہے فسطائیت کا جادو
لٹی ہے انسانیت کی خوبو
مٹی ہے جمہوریت کی خوشبو
ہر اک طرف ہے مچی تباہی
دکھاؤ تم اپنی کج کلاہی
یہ حسنِ اخلاق کا اثر تھا
نگاہوں میں غیرتوں کا گھر تھا
تمہارا ہر قول معتبر تھا
نبیؐ کا پیرو ہر اک بشر تھا
اسی لیے نیل سے ختن تک
تمہارا چرچا ہر انجمن تک
لقب تمہارا تھا خیر امت

تمھیں کو سونپی گئی امامت
تمھارے حق میں خدا کی نصرت
تمہارا شیوہ تھا عدل و حکمت
سخاوتوں کا تھا فیض جاری
ہوئی تمدن کی آبیاری

بسمل اعظمی نے مسدس کے فارم میں کئی کامیاب نظمیں لکھی ہیں جو ان کے مجموعۂ کلام 'کشتِ دل' کی زینت میں اضافہ کرتی ہیں۔اسی بنا پر محترم رؤف خیر حیدرآبادی نے انھیں قتیل مسدس کے لقب سے یاد کیا ہے اوران کے فن شاعری پر بھرپور داددی ہے۔

''مسدس کا فارم اردو شعروادب میں زیادہ تر کربلائی واقعات کو نظم کرنے کے لیے مختص ہوکررہ گیا تھا مگر علامہ اقبال نے اسے مزید وسعت وترقی دی اور مولانا حالی نے اپنی شاہ کار نظم کے ذریعے مسدس کو نئی زندگی عطا کی، پھر اقبال نے بانگِ درا میں 'ہمالہ' سے لے کر، شکوہ، جوابِ شکوہ' تک مسدس میں کئی جدید نظمیں کہہ کر اپنی پہچان قائم کی۔

جناب بسمل اعظمی بھی مسدس کو محبوب رکھتے ہیں ان کی تقریباً تمام نظمیں اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں، البتہ انھوں نے کسی خاص بحر کو اپنے اوپر لازم نہیں کیا۔'' (کشتِ دل، ص:۲۳)

اردوزبان کی اہمیت ومعنویت کے پیش نظر مسدس ہی کے فارم میں انھوں نے ایک طویل نظم 'اردو ہے جس کا نام ہماری زبان ہے'' کے عنوان سے اردو ادب کی گویا ایک منظوم تاریخ تحریر کردی ہے۔اس نظم کے چند اشعار لائق توجہ ہیں:

دشمن کی کل صفوں میں مچی اس سے کھل بلی
گھبرائے اس کے نعروں سے ہی لارڈولزلی
بنگال کا محاذ یامیدانِ شاملی
تحریکِ انقلاب کو اس سے جلا ملی
میدانِ کارزار میں بھی کامران ہے
اردو ہے جس کا نام ہماری زبان ہے

آج کے اس پرآشوب دور میں کون اپنا ہے، پہچاننا بڑا مشکل ہے، ہر طرف تملق پسندی، مصلحت کوشی اور جی حضوری کا چلن ہے، کہیں سینیارٹی کے نام پر اپنے جونیئر کو ابھرنے نہیں دیا جاتا اور کہیں کالج اور ادارے کے سر براہ اپنی سفید پوشی اور وضع داری کی دبیز خول میں اپنے مصنوعی بڑکپن اور اپنے عہدے کا مظاہرہ کرتے ہیں حالانکہ ''بڑے آدمی کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں کا خیال رکھتا ہے۔ اس کی دل شکنی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ وہ امیر شہر کے فنکشن میں جا کر اس کی محفل کا ثنا بننے کے بجائے کسی غریب اور گمنام آدمی کی مجلس میں بیٹھ کر اس کا ہم دم بننا پسند کرتا ہے۔''
(دعوت، ۷نومبر ۲۰۱۶ء)

ایسے ہی ماحول کی عکاسی کرتی ہے یہ نظم ،فخر عالم اعظمی۔ شاعر ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ شخصیت کا مالک ہے اور اس نظم کے ذریعہ سے ایسے لوگوں کو آئینہ دکھایا ہے جو اپنے مفاد اور اپنی حکومت کی زد میں کتنے باصلاحیت نوجوانوں کے مستقبل سے کھلواڑ کرتے ہیں۔ ان کے سامنے اگر خوفِ خدا ہوتا تو شاید اس توڑ جوڑ کی سیاست کا وہ شکار نہ ہوتا وہ واقعی ''شہرت کی جگہ عزت کا طلب گار رہوتا کیوں کہ عزت دلوں میں جگہ پاتی ہے۔ شہرت عبرت بننے میں دیر نہیں لگتی۔ شہرت عارضی ہوتی ہے، عزت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔'' (دعوت، ۷نومبر ۲۰۱۶ء)

نظم کے چند بول کچھ اس طرح سے ہیں:

تری عظمتوں سے لرزاں ہیں ترے ادب مخالف
ترے ہم سفر بھی اکثر چلے چال شاطرانہ
تو غم والم کا خوگر تو مشقتوں کا عادی
کئی بار لے چکاہے ترا امتحاں زمانہ
تری ٹھوکروں کی زد میں رہی مصلحت کی دنیا
ترا ہرقدم اٹھا ہے لیے عزم فاتحانہ
تو رواں دواں ہے پھر بھی اسی طرح سوئے منزل
دیا موڑ تونے اکثر رخِ گردش زمانہ
نہ کیا کسی کے در پہ تری غیرتوں نے سجدہ

نہ اٹھائے تیرے دل نے کبھی ناز خسروانہ

وقت ایک انمول خزانہ ہے لیکن اسی کو سب سے زیادہ لوگ برباد کرتے ہیں اور کم لوگوں کو اس اہمیت کا اندازہ ہو پاتا ہے۔ شاعر کس خوبصورتی سے اس کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

نعمت کم یاب ہے
دولت نایاب ہے
لمعۂ بے تاب ہے
اور پرِ سُرخاب ہے
ہے اسی سے سرمدی
اس کے ہیں سب مقتدی

مجموعی اعتبار سے 'کشتِ دل' ایک کامیاب مجموعۂ کلام ہے۔ غزلوں کی طرح اس کی بعض نظمیں سماج کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ایک نقاد جب جوہری بن کر اس کا جائزہ لے گا تو اس کی معنویت مزید دوچند ہوگی اور امید کی جاتی ہے کہ ادبی دنیا میں اس کا زوردار استقبال کیا جائے گا۔ اور یہ استقبال کیوں نہ ہو جب اس کا تخلیق کار بجاطور پر اس کا خود مستحق ہے۔

اے نگاہِ ناز ان میں آچلے ہیں برگ وبار
کشتِ دل میں تونے بویا تھا جو تخمِ آرزو

شکیل الرحمن*

ہندوستان میں سلاسل اربعہ
ایک تعارف

اہلِ تصوف تزکیہ نفس اور احسان کو تصوف سے تعبیر کرتے ہیں۔ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے انسان کے ظاہر و باطن کی اصلاح شدید ضروری ہے، اور ظاہر کی اصلاح کا دار و مدار باطن پر ہوتا ہے اس لیے اہلِ تصوف نے باطن کی اصلاح کے لیے کچھ مخصوص طریقے یعنی خود کو دنیا کی غیر ضروری مصرفیت سے الگ کر کے کسی پیر و مرشد کی نگرانی میں مخصوص اذکار کا اہتمام کرنا، اختیار کیے ہیں۔ نفس کی پاکی کے لیے ان مخصوص طرز عمل کو اختیار کرنے والے کو صوفی کہا جاتا ہے۔ تصوف کی راہ کے ابتدائی مسافر کو سالک کہا جاتا ہے۔ ایک سالک سلوک کی اعلیٰ منزل کو حاصل کرنے کے لیے مختلف پریشانیوں کو برداشت کر کے صوفی بنتا ہے۔ صوفیا کا مرکزی موضوع بلا تفریق مذہب و ملت بقول خواجہ معین الدین چشتی: ''محبت سب کے لیے اور نفرت کسی سے نہیں'' ہے۔ ہندوستان کو مختلف سلاسل تصوف کی مرکزیت حاصل ہے جن میں سلاسل اربعہ کا خصوصی مقام ہے۔

ہندوستان میں تصوف

یہ معروف ہے کہ ہندوستان میں تصوف کی داغ بیل داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری کے ذریعہ

* ریسرچ اسکالر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ای میل: Shakeelmau7@gmail.com

ڈالی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ صوفیاء میں سب سے پہلے آپ ہی ہندوستان آئے تھے۔ ہندوستان میں ان کی آمد کا سال ۱۰۴۱ء بمطابق ۴۳۰ھ بتایا جاتا ہے۔ ان کی تبلیغ کا مرکز لاہور تھا اور وہیں پر ۱۰۷۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد آہستہ آہستہ کئی صوفیاء نے بغداد اور ایران کے علاقہ سے ہندوستان کا رخ کیا اور یہیں پر سکونت اختیار کی۔ لیکن جب تصوف کے مختلف مراحل کو تاریخ کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علی ہجویری سے پہلے بھی کئی صوفی یہاں آچکے ہیں۔ ہندوستان میں صوفیاء کا پہلا مرکز سندھ وملتان تھا۔ اس کے بعد لاہور تصوف کا سب سے بڑا مرکز بنا۔

تاریخی اعتبار سے شیخ ابوعلی سندھی کا شمار ہندوستان کے اولین صوفیا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ میں سکونت اختیار کی تھی۔ ان کے بعد شیخ صفی الدین حقانی گارزونی جو کہ خواجہ ابواسحاق گارزونی کے مرید تھے، ہندوستان وارد ہوئے۔ انھوں نے موجودہ پاکستان کے علاقہ بہاول پور میں سکونت اختیار کی اور اسی کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا۔ وہیں پر ۱۰۰۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔[۱] ہندوستانی صوفیا میں ایک اہم نام شیخ اسماعیل بخاری کا ہے۔ یہ ۱۰۰۵ء یا ۱۰۰۷ء میں لاہور آئے اور وہیں مدفون ہیں۔[۲] ان کے بعد شیخ حسین زنجانی نے سلسلہ طریقت کو پانے کے بعد اپنے پیر کے حکم سے لاہور میں سکونت اختیار کی۔ ان کے انتقال کے وقت ان کے پیر نے ان کے ساتھی شیخ علی ہجویری کو لاہور میں سکونت کا حکم دیا۔[۳] انھوں نے پیر کے حکم پر پہلے پنجاب کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا اس کے بعد لاہور منتقل ہوئے اور وہیں پر اپنی خانقاہ قائم کی۔ انھوں نے تصوف کے فروغ میں کئی کتابیں تحریر کیں، جن میں کشف المحجوب' کو کافی زیادہ شہرت ملی۔

شیخ علی ہجویری کے بعد ہندوستان میں صوفیا کی آمد کا سلسلہ جاری ہوگیا، جن میں سب سے زیادہ شہرت خواجہ معین الدین چشتی کو ملی۔ انھوں نے ہندوستان میں لاہور اور دہلی میں قیام وتبلیغ کے بعد اجمیر کو اپنا اصل مرکز بنایا اور وہیں پر سپردِ خاک ہوئے۔ ان کے بعد تصوف تدریجی مراحل کو طے کرتے ہوئے عہدِ سلطنت میں اپنے اوج کمال کو پہنچا۔ ہندوستان کے علاقہ ملتان، لاہور، اجمیر، اجودھن اور دلّی اس کے مرکزی مقام رہے ہیں۔ ہندوستان میں تصوف کے فروغ میں خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی (متوفی: ۱۲۳۵ء)، بہاء الدین زکریا ملتانی (متوفی: ۱۲۶۲ء)، فرید الدین گنج شکر (متوفی: ۱۲۶۵)، حمید الدین ناگوری (متوفی: ۱۲۷۴ء)، نظام الدین اولیاء (متوفی: ۱۳۲۵ء)،

نصیرالدین چراغ دہلوی (متوفی: ۱۳۳۷ء)، سید میر علی ہمدانی (متوفی: ۱۳۸۴ء) اور خواجہ باقی باللہ (متوفی: ۱۶۰۳ء) وغیرہ کا اہم کردار رہا ہے۔

شیخ علی ہجویری سے قبل ہندوستان میں موجود صوفیاء کا کسی خاص صوفی سلسلہ سے تعلق نہیں ملتا ہے۔لیکن ان کے بعد جتنے بھی صوفیاء آئے وہ سب کسی نہ کسی سلسلے سے منسلک تھے اور وہ سب اپنے اپنے سلسلے کی تبلیغ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں صوفی سلسلے کے آغاز کے بارے میں خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> "ہندوستان میں پہلے چشتیہ سلسلہ کی بنیاد پڑی۔ اس کے بعد سہروردیہ سلسلہ وجود میں آیا۔انہیں دونوں سلسلوں کا دلی سلطنت کے ابتدائی عہد میں غلبہ رہا، اور اسی عہد میں ایک تیسرا سلسلہ فردوسیہ کا قیام ہوا۔جس کے فروغ میں شرف الدین یحیی منیری کا بڑا نام ہے۔پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں قادریہ اور شطاریہ سلسلے ہندوستان میں قائم ہوئے اور اکبر کے عہد حکومت میں خواجہ باقی بالله نے نقشبندیہ سلسلہ کی بنیاد ہندوستان میں رکھی۔"[۴]

مذکورہ سلاسل کے علاوہ بعد کی صدیوں میں رفاعیہ، نظامیہ، صابریہ، مجددیہ اور امدادیہ وغیرہ مختلف سلاسل وجود میں آئے۔لیکن ان سب میں مذکورہ بالا چار سلاسل کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔انھیں کی شاخیں ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ان چاروں میں بھی چشتی سلسلہ کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے۔ پورے ہندوستان میں اسی کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی خانقاہیں زائرین ومتوسلین کا مرکز ہیں۔

سلاسل اربعہ کا تعارف

ہندوستان میں سب سے پہلے چشتیہ سلسلہ کا ہی ورود ہوا اور اسی نے پورے ملک میں تصوف کو

متعارف کرایا۔ ہندوستان میں ہی اس سلسلے کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔ اس کی نسبت خراسان کے ایک چشت کی جانب ہے۔ یہاں کے کچھ نیک لوگوں نے دسویں صدی عیسوی میں عوام کی روحانی اصلاح کے لیے ایک تنظیم قائم کی، جس کے روح رواں ابو اسحاق شامی چشتی (متوفی: ۹۴۰ء) تھے۔ سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (متوفی: ۱۲۳۶ء) نے اسی سلسلہ کو بامِ عروج پر پہونچایا۔

خواجہ اجمیری خواجہ عثمان ہارونی کے مرید تھے۔ انھوں نے چشتیہ سلسلہ کو اپنانے کے بعد ایران، کوفہ، مکہ، مدینہ اور بغداد وغیرہ علاقوں کے صوفیاء سے فیضِ یاب ہوتے ہوئے ۱۱۶۵ء میں لاہور میں شیخ علی ہجویری کے مزار پر حاضری دی۔ کچھ ماہ وہاں رہ کر انھوں نے دہلی کا رخ کیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد انھوں نے پرتھوی راج چوہان کی راجدھانی اجمیر کو اپنا مستقر بنایا۔ یہیں سے انھوں نے پورے ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کی تبلیغ کی۔ عوام وخواص نے انھیں 'سلطان الہند'، 'نائب رسول' اور 'غریب نواز' جیسے القاب سے نوازا۔[۵]

خواجہ اجمیری نے چشتیہ سلسلہ کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کے لیے اپنے مختلف مریدین و خلفاء کو ہندوستان کی الگ الگ جگہوں پر بھیجا۔ ان میں دو نام خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ حمید الدین ناگوری بہت ہی اہم اور مشہور ہیں۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے دہلی کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا اور حکومت کے زیرِ سایہ اپنے تبلیغی مشن کو آگے بڑھایا اور انھیں کی زیر تربیت بابا فرید الدین گنج شکر کی شخصیت پیدا ہوئی، جنھوں نے پاک پٹن کے علاقہ میں تبلیغ و اشاعت کا کام کیا۔ انھیں کے خلفاء میں شیخ نظام الدین اولیاء اور شیخ علاء الدین علی احمد صابر کلیری کا بڑا نام ہے۔ ان دونوں سے چشتیہ سلسلہ کی دو شاخیں نظامیہ اور صابریہ نکلتی ہیں۔ ان کے بعد اکثر صوفیاء ان ہی دونوں کے توسط سے چشتیہ سلسلہ سے منسلک نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ نے کس طرح عروج کی منزل کو طے کیا اس کی وضاحت میں خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> "ھندوستان میں چشتیه سلسله کی داغ بیل معین الدین چشتی اجمیری کے ھاتھوں پڑی۔ بابا فرید گنج شکر نے اسے منظم کیا اور شیخ نظام الدین اولیا نے اسے معراج کمال تك کا پهنچایا ...محبوب الٰهی کی کوششوں سے

چشتیہ سلسلہ کے اثرات ہندوستان کے ہر ہر حصہ میں پھونچ گئے۔[۶]

مذکورہ بالا بزرگوں کے علاوہ اس سلسلے میں مولانا قاسم نانوتوی (۱۸۸۰ء)، مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۹۰۵ء)، شیخ الہند مولانا محمود الحسن (۱۹۲۰ء) اور مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳ء) وغیرہ کے معروف نام ہیں جنھوں نے کتاب وسنت کی تعلیمات کے ساتھ باطنی تعلیمات کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

تعلیمات

اس سلسلہ کی بنیاد ذکر بالجہر اور حفاظت نفس کے ساتھ شیخ سے محبت وتعظیم پر قائم ہے۔اس کے علاوہ اس کی تعلیمات میں تخلیہ،تحلیہ ،تجلیہ ،مجاہدہ،محاسبہ،مراقبہ،علم الیقین کوحق الیقین بنانا،معرفت اجمالی کومعرفت تفصیلی میں تبدیل کرنا،مقامات فنا کا حصول،تواضع اور حب شرعی وغیرہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔سالک کوسورج ،میٹھا چشمہ اور زمین کی مانند فیاضی اور صبر وتحمل کی تلقین کے ساتھ اللہ کا دائمی احضار،رسول وصحابہ کی تعظیم شریعت وطریقت اور حقیقت پر عمل نیز اذکار واوراد کی مداومت کا حکم دیا جاتا ہے۔ چشتیہ نظامیہ اور چشتیہ اور صابریہ کے یہاں کلمہ شہادت پڑھتے وقت لا الہ الا اللہ پر زور اور سر وجسم کے اوپری حصہ کو جھٹکا دیا جاتا ہے۔ان کے یہاں کثرت صوم،تہجد اور وضو کی پابندی اور کم گفتن وکم خوردن وکم خفتن پر بہت زور دیا جاتا ہے۔

سہروردیہ سلسلہ

لوگوں نے عام طور پر شیخ ابوحفص شہاب الدین سہروردی کواس سلسلہ کا بانی مانا ہے جبکہ محققین کے نزدیک اس کے اصل بانی شہاب الدین سہروردی کے چچا شیخ ضیاء الدین ابوالنجب عبدالقاہر سہروردی متوفی ۵۶۳ھ ہیں۔ان کی خانقاہ دجلہ ندی کے کنارے آباد تھی۔ضیاء الدین کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے شیخ شہاب الدین سہروردی ان کے خلیفہ بنے۔انھوں نے اس سلسلہ کی ترویج واشاعت کے لیے بڑی محنت کی اور تمام روحانی نظامِ عمل کی تفصیلات کو اپنی کتاب "عوارف المعارف" میں بیان کر دیا۔ شیخ شہاب الدین نے ہندوستان میں سہروردیہ سلسلہ کی اشاعت کے لیے اپنے کئی مرید بھیجے جن میں شیخ

نورالدین مبارک غزنوی، شیخ ضیاءالدین رومی اور قاضی حمیدالدین ناگوری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، لیکن ہندوستان میں شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کو سہروردیہ سلسلہ کا بانی مانا جاتا ہے، کیونکہ انھوں نے ملتان، اوچہ اور دیگر مقامات پر سہروردیہ سلسلہ کی مشہور خانقاہیں قائم کیں اور دعوت و تبلیغ دین کے علاوہ سہروردیہ سلسلہ کی تعلیمات کا آغاز کیا اور اس کے لیے انھوں نے اپنے مختلف خلفاء کو مختلف علاقوں میں پھیلا دیا۔ مندرجہ ذیل؛ شیخ جلال الدین سرخ پوش بخاری، لعل شباوز قلندر، فخر الدین عراقی، جلال الدین تبریزی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔[۷]

شیخ بہاءالدین کی وفات کے بعد جب ان کے صاحبزادے شیخ صدرالدین عارف نے سجادہ سنبھالا تو ان پر چشتیہ سلسلہ کا غلبہ ہو گیا۔ جس کا اثر مریدین پر بھی پڑا، لیکن ان کے بعد جب ان کے بیٹے ابوالفتح رکن الدین سجادہ نشین ہوئے تو انھوں نے دادا کی روش کو دوبارہ زندہ کیا۔ انھوں نے محمد تغلق وغیرہ سلاطین سے روابط استوار کر کے مظلومین کی دادرسی کی، جس کے نتیجے میں سہروردیہ سلسلہ کشمیر، دکن، بہار و بنگال اور گجرات و سندھ تک پھیل گیا۔ برصغیر کے علاوہ سہروردیہ سلسلہ ایران و خراسان میں بھی بہت مقبول ہوا۔

تعلیمات

اس سلسلے میں اتباعِ سنت پر کافی زور دیا جاتا ہے کیونکہ شیخ شہاب الدین اور ان کے پیر و مرشد ضیاء الدین سہروردی نے احادیث کی روشنی میں تصوف کے اصول اور اس کے اسرار و رموز کو ثابت کیا ہے۔ سلاطین و حکام کو دینی مسائل سے آگاہ اور متنبہ کرنے کے لیے سہروردی صوفیا ان سے قریبی روابط کو جائز سمجھتے ہیں۔ روزہ، تہجد، دعائے ماثور اور وظائف وغیرہ کی پابندی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں سانس بند کر کے اللہ کا ذکر بڑا معروف ہے۔ یہ لوگ ذکر جلی و خفی دونوں کے قائل ہیں۔ سماع کو پسند نہیں کرتے بلکہ اس کے مقابلہ میں تلاوتِ قرآن کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے موسیقی و سماع کا ذکر ان کے یہاں بہت کم ملتا ہے۔ یہ لوگ سیر و تفریح اور تبلیغ دین کو پسند کرتے ہیں، اپنے مریدوں کی خوب حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اور ان کو اذکار و اوراد، محاسبہ، مجاہدہ، مراقبہ و معائنہ، مشاہدہ اور مرتبہ احسان کے حصول کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس سلسلے کے صوفیا میں جلال، ادبیات اور شعر و شاعری کا ذوق بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

قادریہ سلسلہ

اس سلسلہ کے بانی شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی ہیں۔ان ہی کی نسبت سے اس سلسلے کو قادریہ کہا جاتا ہے۔انھوں نے اپنے مریدین وخلفا کومختلف علاقوں میں اس سلسلے کی نشرواشاعت کے لیے بھیجا۔ان کی وفات کے بعدان کے فرزندان عبدالوہاب اورعبدالرزاق کےعلاوہ ان کے خلفاء شیخ علی حداد نے یمن میں، محمد بطائی نے شام میں اور محمد بن عبدالصمد نے مصر میں قادریہ سلسلہ کو پھیلانے کا کام انجام دیا۔

ہندوستان میں قادریہ سلسلہ کوسب سے پہلے عام کرنے والےمشہور روایت کےمطابق نعمت اللہ قادری تھے۔بہمنی سلطان شہاب الدین احمد اول کی درخواست پرانھوں نے اپنے پوتے شیخ نوراللہ کو دکن بھیجا تھا۔جسے انھوں نے قادریہ سلسلہ کا پہلاتبلیغی مرکز بنایا۔[۸] بعض لوگوں نے مخدوم شیخ محمد حسینی جیلانی کا نام لکھا ہے۔جنھوں نے بغداد سے آکر ملتان کے ایک قصبہ اوچ میں قیام کیااور اسے اس سلسلہ کا دوسرا اہم مرکز بنایا۔ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند مخدوم شیخ عبدالقادر ان کے جانشین بنے۔انھیں عبدالقادر ثانی بھی کہا جاتا ہے۔یہ قادریہ سلسلہ کےمجسم پیکر تھے۔ان کی وفات کے بعد ان کےفرزند شیخ عبدالرزاق نے سجادہ سنبھالا اورتربیت باطنی کے قادری طریقہ کوآگے بڑھایا۔ان کے بعد مخدوم شیخ حامد نے ذمہ داری لی جن کی بزرگی سے قادریہ سلسلہ کو بڑا فروغ ملا۔نیز ان کی اور شیخ داؤد کی مشترکہ کوششوں سے قادری سلسلہ بہت مقبول ہوا۔[۹]

ہندوستان میں قادری سلسلہ کے بڑے ناموں میں شاہ محبوب اللہ، شاہ ندیم اللہ، شاہ شاہد اللہ، شاہ کاظم قلندرقادری، شاہ تراب قلندرقادری اوراحمد رضا خاں بریلوی قادری وغیرہ بڑے اہم ہیں۔ سیدمحمدغوث گیلانی اورعبدالحق محدث دہلوی وغیرہ نے مغلیہ عہد میں قادریہ سلسلہ کومقبول عام بنانے کی بھرپورکوشش کی۔

تعلیمات

قادریہ سلسلہ سماع بالمزامیر کا مخالف ہے۔یہ ذکرجلی وخفی دونوں کو جائز سمجھتا ہے۔موسیقی کے

مقابلہ میں درود شریف کے ورد کو ترجیح دیتا ہے۔ اگرچہ مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی اس کی مختلف شاخوں کے درمیان وظائف واذکار میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ الفیوضات الربانیہ کو بالعموم مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ حارث محاسبی کے اصول ہشت گانہ توحید، تفویض، ترک اختیار، کتاب وسنت کے احکام ظاہرہ و باطنہ کے مطابق زندگی ڈھالنے، صلوٰۃ غوثیہ، وظیفہ یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کے پڑھنے اور عبدالقادر جیلانی کے تصرفات بعد وفات پر بھی تقریباً سبھی کا اتفاق ہے۔ اسی طرح ہوش وحواس کے ہوتے ہوئے ہر شخص کے شریعت محمدیہؐ کے مکلّف ہونے میں بھی سب کا اتفاق ہے۔ لیکن مسئلہ سماع، سجدہ تعظیمی، طواف مزار، زیارت قبر برائے خواتین وغیرہ میں اکثر مشائخ قادریہ حرمت کے قائل ہیں۔

نقشبندیہ سلسلہ

اس سلسلہ کا اصل نام سلسلہ خواجگان ہے۔ روحانی سلسلوں میں سب سے پہلے یہی سلسلہ عالم وجود میں آیا، لیکن اس کے اصل بانی کا پتہ نہیں۔ اس کے تعلق سے خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> " قدامت کے اعتبار سے سلسلہ خواجگان سب سے پہلے آتا ہے۔ یہ سلسلہ ترکستان میں قائم ہوا تھا۔ اس کے سب سے زیادہ مشہور بزرگ خواجہ محمد اتالیویی (متوفی: ۱۱۶۶ء) ہیں۔ان کے بعد خواجہ عبد الخالق گجدوانی (متوفی:۱۱۷۹ء) نے سلسلہ کی مندرجہ ذیل اصطلاحات وضع کیں اور ان کو اپنے روحانی نظام کا لازمی جز بنا دیا۔ پوش دردم ، نظر بر قدم، سفر در وطن،خلوت در انجمن، یاد کرد، بازگشت، نگاہ داشت ،یاد داشت۔
>
> خواجہ اتالیوبی اور خواجہ گجد وانی نے اس سلسلہ کو فروغ دینے کے لیے بڑی کوششیں کیں، لیکن

اس کو مقبول عام بنانے کا شرف خواجہ بہاء الدین نقشبندی (متوفی ۱۳۸۸ء) کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ ان کے بعد یہ سلسلہ نقشبندیہ سلسلہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ خواجہ نقشبند نے اتباع سنت پر خاص زور دیا....گو سلسلہ خواجگان سب سے قدیم سلسلہ ہے لیکن ھندوستان میں یہ سلسلہ سب سلسلوں کے بعد پہونچا۔ خواجہ باقی باللہ (متوفی ۱۶۰۸ء)اس کو ہندوستان میں لائے۔"[۲۰]

چشتیہ سلسلہ کی طرح نقشبندیہ سلسلہ کی بھی مختلف شاخیں مثلاً باقیہ، مجددیہ اور احسنیہ وغیرہ ہندوستان میں پروان چڑھیں۔لیکن ان سب میں مجددیہ سلسلہ کوسب سے زیادہ شہرت ملی۔اسے خلیق احمد نظامی نے نقشبندیہ کا تیسرا نام بتایا ہے۔مجددیہ سلسلہ خواجہ باقی باللہ کے مرید خاص اور خلیفہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی طرف منسوب ہے۔جنھوں نے اتباع سنت اور ترک رسومات و بدعات پر زور دیا۔احیاء سنت و طریق نبوت کے لیے زبردست خدمات انجام دیں اور مشرکانہ رسوم اور غیر اسلامی تصورات و اثرات کے خلاف علم جہاد بلند کیا،لیکن ان کے بعد اس سلسلہ کے کچھ لوگوں نے بدعات وغیرہ کا ارتکاب کیا۔اس سلسلے کے معروف بزرگوں میں علاء الدین عطار، ناصر الدین عبید اللہ احرار، عبدالرحمٰن جامی، محمد زاہد وخشی، درویش محمد، شیخ محمد سعید، شیخ محمد معصوم، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ عبد الرحیم فاروقی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

تعلیمات

اس سلسلہ کی تعلیمات میں کامل اتباعِ سنت، اخفائے حال اور ظاہری رسوم وطریقوں سے دوری پر زور دیا جاتا ہے۔اسی وجہ سے یہ لوگ ذکر جلی، موسیقی اور سماع کے سخت مخالف ہیں۔ یہ لوگ مراقبہ میں سر جھکا کر یا زمین پر رکھ کر آنکھ بند کر لیتے ہیں۔اہلِ سنت والجماعت اور ائمہ سلف کے مسلک کو اختیار کرنا ان کی بنیادی خاصیت ہے۔اسی وجہ سے مرشد حلقے میں بیٹھ کر لوگوں کی توجہ باطن کی طرف

مبذول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بیعت کے وقت مریدوں کا حلق کر کے انھیں توبہ واستغفار کی تلقین کی جاتی ہے۔ الغرض یہ لوگ اپنے اصل مقصد، عقائد کی اصلاح، کثرت عبادت اور اللہ سے بندوں کے تعلق کو مضبوط کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ یہ اللہ سے قربت کے تین طریقے بتاتے ہیں: ذکر، مراقبہ اور ربط شیخ۔

خلاصہ کلام یہ کہ تصوف کا آغاز دوسری صدی ہجری میں عراق کے ایک مشہور شہر کوفہ سے ہوتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں اس کی کچھ خاص اصطلاحات وضع کی گئیں، صوفیائے کرام کے گروہ و جماعت کا وجود ہوا، جس نے بعد میں سلسلے کی شکل اختیار کی۔ ساتویں صدی ہجری میں تصوف اپنی بلندی کی چوٹی پر پہنچ کر دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیل جاتا ہے۔ پانچویں صدی ہجری میں ہندوستان بھی اہلِ تصوف سے متعارف ہوتا ہے اور پھر کچھ سالوں میں مختلف سلاسل کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ جن میں سلاسل اربعہ (چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ) کی خوب شہرت ہوئی۔ ان تمام سلاسل تصوف نے عبادت و ریاضت کے کچھ مخصوص طریقے وضع کیے ہیں جن پر ہر ایک سالک اور مرید کو عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ عبادت و ریاضت اور فنا فی اللہ کے مخصوص طریقہ کو تعلیمات کا نام دیا گیا ہے۔ صوفیا کی ان تعلیمات میں سے کچھ پر ان کے سارے سلاسل متفق ہیں جیسے مراقبہ، محاسبہ اور رضائے الٰہی وغیرہ اور کچھ کے بارے مختلف ہیں جیسے سماع، ذکر جلی اور طواف مزار وغیرہ۔ یہی اختلاف صوفیا کے مختلف سلاسل کا امتیاز اور وجہ تفریق بھی ہے۔ ان تعلیمی اختلاف کو لے کر ان میں ٹکراؤ بھی ہوا ہے۔ اس لیے ہر ایک نے الگ الگ اپنے سلسلہ کی تبلیغ کی۔ جس سے آپس میں رقابت پیدا ہوئی اور نتیجتاً ایک سلسلہ کا آدمی دوسرے سلسلہ کی مجلس میں بیٹھنے کو ترجیح نہیں دیتا تھا۔ لیکن اب اس معاملہ میں بڑی نرمی آئی ہے اور لوگ ایک دوسرے سے قریب ہو رہے ہیں۔

حواشی

۱۔ تصوف اور صوفیا کی تاریخ — محمد حفیظ الرحمٰن، شاکر پبلی کیشنز (لاہور) ۲۰۱۴ء، ص: ۵۵
۲۔ اولیاے لاہور — محمد لطیف ملک، سنگ میل پبلی کیشنز (لاہور) ۱۹۶۲ء، ص: ۲۵

۳۔ بزم صوفیہ — صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین (اعظم گڑھ) ۱۹۶۱ء، ص: ۱۰

۴۔ تاریخ مشایخ چشت، ص: ۴۔۱۳۳

۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: بزمِ صوفیہ — صباح الدین عبدالرحمٰن اور تاریخ مشائخ چشت — خلیق احمد نظامی

۶۔ تاریخ مشائخ چشت، ص: ۱۷۱

۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: Sufism an Introduction by Dr. Farida Khanam

۸۔ Sufism: An Introduction P. 123

۹۔ Ibid, P. 124

۱۰۔ تاریخ مشائخ چشت، ص: ۱۳۰

مراجع ومصادر

۱۔ تلبیس ابلیس — عبدالرحمٰن بن علی ابن الجوزی، دار الفکر للطباعة والنشر، الطبعة الاولی (بیروت) ۲۰۰۱ء

۲۔ الرسالة القشیریة — عبدالکریم بن ہوازن القشیری/تحقیق: ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، دار المعارف (قاہرہ)

۳۔ طبقات الصوفیة — ابوعبدالرحمٰن السلمی/تحقیق: مصطفیٰ عبدالقادر عطا (بیروت) دار الکتب العلمیة

۴۔ تاریخ مشائخ چشت — خلیق احمد نظامی، ندوة المصنفین، اردو بازار (دہلی) ۱۹۵۲ء

۵۔ تصوف اور صوفیا کی تاریخ — محمد حفیظ الرحمٰن، شاکر پبلی کیشنز (لاہور) ۲۰۱۴ء

۶۔ اولیایے لاہور — محمد لطیف ملک، سنگ میل پبلی کیشنز (لاہور) ۱۹۶۲ء

۷۔ بزم صوفیہ — صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین (اعظم گڑھ) ۱۹۶۱ء

۸۔ Khanam, Farida. Sufism: An Introduction. New Delhi, Goodword books, 2009

(سہ ماہی)

اسلام اور عصرِ جدید

کے خاص شمارے

سیرت ومغازی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین............۲۰۰روپے
اسلامی تہذیب وتمدن (دورِ جاہلیت سے آغاز اسلام تک)............۳۰۰روپے
نذرِ علی محمد خسرو...۱۰۰روپے
بیاد خواجہ غلام السیّدین..۱۰۰روپے
بیاد پروفیسر مشیر الحق..۲۰۰روپے
افکارِ ذاکر...۱۵۰روپے
مولانا عبیداللہ سندھی..۲۰۰روپے
ڈاکٹر سید عابد حسین اور نئی روشنی.....................................۲۵۰روپے
مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت...۱۵۰روپے
نذرِ رومی...۲۰۰روپے
قرآن مجید، مستشرقین اور انگریزی تراجم.........................۱۰۰روپے
پیکر دین ودانش: امام غزالیؒ...۳۰۰روپے
معلمِ عصر: سعید نورسیؒ ۲۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی ۱۰۰روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۱۵فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Vol. LVII | No. 03 | RNI No. 17614/69 | July 2025

ISLAM AUR ASR-I-JADEED

Peer Reviewed

ISSN 2278-2109

Zakir Husain Institute of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, New Delhi110025
Phone:011-26841202